عالمگیر ترتیب دی، اسی جذبہ کے تحت پاکستان میں معین المعارف کے اہتمام میں یوم عالمگیر منایا گیا، جس میں ملک کے لائق اہل علم اور تاریخ دانوں نے عالمگیر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین پڑھے، ان ہی مضامین کو اس مجموعہ میں شامل کر کے شائع کر دیا گیا ہے، ان میں ہر مضمون تحقیق و محنت کا نمونہ ہے، خاص طور پر ڈاکٹر معین الحق، سخاوت علی خسرو، فروغ علوی کے مضامین کافی فکر انگیز ہیں، عالمگیر پر تحقیق کے سلسلہ میں یہ ایک اچھا قدم اٹھایا گیا ہے، توقع ہے کہ اسے مقبولیت حاصل ہوگی،

من سمجھاؤن - از تراب چشتی، مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، صفحات ۹۶، کتابت و طباعت متوسط، ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، قیمت :- ۲ے

سترھویں صدی میں مہاراشٹر میں ایک مشہور سنت شاعر رام داس گذرے ہیں جن کی مرہٹی نظم مناچے شلوک یا منو بودھ بہت مشہور ہے، اس میں توحید وجودی کے فلسفہ کے ساتھ ضبط نفس، ترک دنیا، نیکی اور فرض شناسی کی ترغیب دی گئی ہے، اس نظم میں سنیاس کی وہ تصویر پیش نہیں کی گئی ہے جو عام طور پر سادھوؤں میں رائج ہے بلکہ انھوں نے مسلمان صوفیہ کی طرح عملی جد و جہد پر بھی ابھارا ہے، یہ نظم مہاراشٹر میں مقبول عام ہے، اس نظم سے متاثر ہو کر بارہویں صدی ہجری کے ایک معروف صوفی شاعر شاہ تراب چشتی نے اسکے جواب ایک نظم "من سمجھاؤن" لکھی، جس میں انھوں نے دل کو مخاطب کر کے اسکو نصیحتیں کی ہیں، "من سمجھاؤن" خیالات کے اعتبار سے "مناچے شلوک" کا ترجمہ ہے مگر حقیقت میں یہ ترجمہ نہیں بلکہ ترجمانی ہے، ترجمہ کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو،

الک نام اللہ نرنجن ہری ہے
نرنکار نرگن وہ پرمیسری ہے

صفت اس کی ہر شے میں دائم بھری ہے	او گنگا و جمنا و گوداوری ہے
وہی ذو الجلال ہور اکرام ہے گا	وہی ساقی، نہ جم گلفام ہے گا

اس کی اشاعت سے اردو ادب کے قدیم ذخیرہ میں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے، اور علماء و صوفیہ کی ابتدائی اردو کی خدمات پر اس سے بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے،

م - ع

جلد ۹۸ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۶ء عدد ۲

مضامین

مقالات

شذرات

آجکل کسی اچھی سے اچھی اور معقول سے معقول تحریک کو بدنام کرنے کا سب سے آسان نسخہ یہ ہے کہ اس کو رجعت پسندی یا سیاسی جتھا بندی کہہ دیا جائے یا کسی سامراجی طاقت کی طرف منسوب کردیا جائے، چنانچہ جمال عبدالناصر ملک فیصل کی اتحاد اسلامی کی بے ضرر تحریک کی مخالفت میں بھی یہی نسخہ استعمال کر رہے ہیں، اور اسکے خلاف برابر زہر اگلتے رہتے ہیں، ان کے مقابلہ میں ملک فیصل کا رویہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ناصر کو اس میں شرکت کی دعوت دی، ابھی حال میں امریکہ کے دورے کے موقع پر جب ان سے نامہ نگاروں نے سعودی عرب پر ناصر کے حملہ کے بارہ میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ناصر ہمارے بھائی ہیں، ہمارے اور انکے درمیان جنگ کا کیا سوال ہے،

جمال عبدالناصر حقیقۃً اسلامی اتحاد کی تحریک کو برا نہیں سمجھتے، ابھی کچھ دنوں پہلے وہ اپنی تقریر اور تحریر دونوں میں اسلامی دنیا کی وسعت پر فخر کا اظہار کرچکے ہیں، اور انکو انڈونیشیا سے لیکر افریقہ تک پھیلی ہوئی اسلامی حکومتوں کے اتحاد میں عظیم الشان امکانات نظر آتے تھے، ان کے اس بیان پر ہندوستان کے اخبارات چراغ پا بھی ہوئے تھے، اتنی جلد ان کے خیالات نہیں بدل سکتے، اصل یہ ہے کہ وہ پوری عرب دنیا کے لیڈر بننا چاہتے ہیں، اس مقصد کے حصول کے لیے اس زمانہ میں سب سے زیادہ کارگر نعرہ عربی قومیت اور عربوں کے اتحاد کا ہے اسلیے انھوں نے اسی کو استعمال کیا، اور اس سلسلہ میں وہ جیسی جیسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں اُن سے سب واقف ہیں، اس میدان میں صرف ملک فیصل ان کے حریف ہیں، انکو دولت و اقتدار کے ساتھ ایک گونہ مذہبی سیادت بھی حاصل ہے، اس لیے ناصر کسی ایسی تحریک کو قبول نہیں کرسکتے جس سے ان کی قیادت کو خطرہ ہو،

ورنہ درحقیقت اسلامی اتحاد کی تحریک عربی قومیت سے کہیں متصادم نہیں ہوتی، بلکہ اس سے عربوں کی وحدت کا مقصد بھی حاصل ہوجاتا ہے، جب اسلامی حکومتوں میں اتحاد ہوگا تو عرب قومیت کو ادنیٰ نقصان پہنچے بغیر عرب وحدت بھی حاصل ہوجائیگی، اس کی مخالفت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ عرب ملکوں میں غیر مسلم بھی آباد ہیں وہ اس دعوت کو کیوں قبول کرنے لگے، اولاً تو عرب ملکوں میں غیر مسلموں کی تعداد بہت کم ہے، صرف لبنان میں دونوں کی آبادی تقریباً برابر ہے، لیکن وہ ایک چھوٹا سا مصنوعی ملک ہے جو ہندوستان کے ایک ضلع کے برابر بھی نہیں، اور اس کی آبادی چند لاکھ سے زیادہ نہیں، مصر میں دس فیصدی قبطی ہیں، باقی اسلامی ملکوں میں ان کی آبادی محض برائے نام ہے، اور جزیرۃ العرب میں تو نہ ہونے کے برابر ہے، ان کے لیے اسلامی حکومتوں کے اہم مفاد کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، دوسرے اسلامی اتحاد کی تحریک جن سنگھ کی طرح اقلیتوں کے خلاف تو ہے نہیں، اس سے ان کے حقوق اور ان کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بلکہ اس سے ان کی حکومتوں کو جو فوائد حاصل ہوں گے ان سے انکو بھی فائدہ پہنچے گا، یہ تحریک کسی قوم کے مقابلہ میں جتھا بندی بھی نہیں ہے، ملک فیصل اس کا بار بار اعلان کرچکے ہیں کہ اس کا مقصد سیاسی نہیں بلکہ اسلامی حکومتوں کے درمیان تہذیبی و اقتصادی اشتراک و تعاون اور ان امور میں ایک دوسرے کی امداد ہے،

یہ عجیب بات ہے کہ اگر دوسرے مذاہب والے اپنے ہم مذہبوں کو آپس میں اتحاد و اتفاق کی دعوت دیں تو وہ نہ رجعت پسندی ہے اور نہ جتھا بندی، اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، لیکن اسلام کا نام آتے ہی اس میں ساری خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں، ابھی سال ڈیڑھ سال ہوئے بمبئی میں عیسائیوں کی ایک بہت بڑی کانفرنس ہوئی تھی جس میں ساری دنیا کے عیسائیوں کو مدعو کیا گیا تھا، اور اسکی صدارت کے لیے خود پاپائے اعظم تشریف لائے تھے، انھوں نے اپنی تقریر میں سب سے زیادہ زور دنیائے عیسائیت کے

اتحاد پر دیا تھا۔ ان کی زیارت کے لیے خود ہندوستان کے صدر جمہوریہ اور ان کے نائب تشریف لے گئے تھے، ہندوستان کے مسلمان تو اس قسم کی اسلامی کانفرنس تصور میں بھی نہیں لا سکتے،

ابھی چند مہینے ہوئے کنبھ کے نہان کے موقع پر ہندوؤں کی ایک آل ورلڈ کانفرنس ہوئی تھی اور اس میں پوری "ہندو دنیا" کو اتحاد و یکجہتی کی دعوت دی گئی تھی، اس میں بعض وزراء تک شریک ہوئے تھے، لیکن جہاں مسلمانوں کے اتحاد کا سوال آتا ہے اُس میں سارے عیب پیدا ہو جاتے ہیں، اس کے جواب میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اہل مذاہب کا آپس میں اتحاد اور چیز ہے اور انکی حکومتوں کا دوسری چیز، اولاً تو یہ دقیق فرق ہم جیسوں کی سمجھ سے باہر ہے، دوسرے اسلامی نقطۂ نظر سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، اس نے تو تمام مسلمانوں کو خواہ وہ افراد و اشخاص ہوں یا جماعتیں اور حکومتیں سب کو یکساں اخوت و اتحاد کی تعلیم دی ہے،

اگر غیر مسلم اسکی مخالفت کرتے ہیں تو وہ ایک حد تک معذور ہیں اسلیے کہ وہ اسلامی اخوت و اتحاد کو سمجھ ہی نہیں سکتے، لیکن حیرت ان مسلمانوں پر ہے جو اس بارہ میں قرآن و حدیث کے صریح احکام کو جانتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے ہیں، مگر وہ غریب بھی اس لیے معذور ہیں کہ وہ دوسروں کے چشم و ابرو کے اشارے کے پابند ہیں

بہر طرز یکہ می رقصانیم اے یار می رقصم

لیکن مسلمانوں میں اتنا اختلاف و انتشار ہو کر خود عربوں میں آپس میں اتحاد و اتفاق نہیں، اس لیے اسلامی اتحاد کی تحریک کی حیثیت ایک خوش آیند خواب سے زیادہ نہیں ہے، ورنہ بقول جمال عبد الناصر وہ انڈونیشیا سے لیکر افریقہ کے آخری کنارے تک ایک عظیم الشان طاقت بن سکتے ہیں۔

مقالات

میرا سفرِ حج

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

سعودی حکومت کے بعض نمایاں دینی کارنامے

سعودی حکومت کے کارنامے ایسے نمایاں ہیں جن سے ان کے مخالفین بھی انکار نہیں کر سکتے، ان سب کی تفصیل مقصود نہیں، اسکے لیے مستقل کتاب کی ضرورت ہے، اس لیے صرف چند نمایاں دینی کارناموں کا ذکر کیا جائے گا، اس نے حجاز جیسے مقام پر جہاں جان کی کوئی قیمت نہ تھی، اتنا امن و امان قائم کر دیا ہے کہ کوئی شخص کسی کے مال کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا، جس کی نظیر دنیا کی کسی حکومت میں نہیں مل سکتی، جرائم تقریباً ناپید ہو گئے ہیں، ہر جگہ تعمیر و ترقی کے آثار نمایاں ہیں،

ان میں سب سے بڑا کارنامہ حرم شریف کی تعمیر ہے، اس کی وسعت و رفعت، شکوہ و عظمت اور حسن و جمال کا بغیر دیکھے اندازہ نہیں کیا جا سکتا، سنگ مرمر کی تین وسیع درجوں کی عظیم الشان سہ منزلہ عمارت ہے جس میں بیک وقت پانچ لاکھ آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں، اب تک اس پر پچاس کروڑ ریال کے قریب صرف ہو چکا ہے، اور ابھی بیس پچیس کروڑ ریال اور صرف ہوں گے، یہ واضح رہے کہ ایک ریال ہندوستان کے دو روپیوں سے زیادہ ہوتا ہے، غالباً دنیا کی کسی عبادت گاہ کی عمارت اتنی عظیم الشان

نہ ہوگی، لیکن جس تناسب سے حاجیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، چند سال کے بعد یہ عمارت بھی ناکافی ہوجائے گی، آج بھی حج کے ایام میں حرم کے باہر سڑک تک نماز ہوتی ہے،

حرم کی تعمیر کے سلسلہ میں راقم اثم کو بھی ایک بڑی سعادت حاصل ہوئی، مدحت کامل صاحب قدوائی نے ایک دن تجویز پیش کی کہ حرم شریف کی توسیع کے مہتمم سید صالح قزاز سے ملا جائے اور اس کے لیے انھوں نے مولانا سعید احمد اکبرآبادی، سید عبدالوہاب صاحب بخاری، عبدالحلیم صاحب ندوی استاد جامعہ ملیہ، مولانا فخرالحسن استاد دارالعلوم دیوبند، مولوی محمد خالد صاحب دیوبند، حیدرآباد کے ایک رئیس جن کا نام یاد نہیں رہا، اور راقم کو مدعو کیا، ممکن ہے کوئی اور صاحب بھی رہے ہوں، اس وقت صرف یہی نام یاد رہ گئے، چنانچہ ایک دن عصر کے بعد ہم لوگ سید صالح صاحب قزاز کے دفتر میں جو حرم سے بالکل ہی ملا ہوا ہے، پہنچے، موصوف بڑے دیندار، اور خلیق آدمی ہیں، بڑے اخلاق سے ملے، قہوہ اور شربت سے تواضع کی، اس کے بعد سب کو حرم کی نئی عمارت تفصیل سے دکھائی، ابھی اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے، ایک جگہ کنکریٹ اور سمنٹ ملائی جارہی تھی، قزاز صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگ بھی اس میں شرکت کیجئے، چنانچہ ہم لوگوں نے ایک ایک تسلہ سمنٹ لیجا کر زیر تعمیر حصہ میں ڈالا، اس طرح تعمیر حرم میں شرکت کی سعادت حاصل ہوگئی، فالحمد للہ علیٰ ذالک،

صفا اور مروہ کے درمیان کی مسافت ایک فرلانگ سے کم نہ ہوگی، پہلے غالباً یہ ایک کھلی سڑک تھی جس کے دورویہ دکانیں تھیں، اور حجاج بازار کے ہجوم میں کھلی سڑک پر سعی کرتے تھے، اب سعودی حکومت نے ان دکانوں کو ہٹا کر پورے صفا اور مروہ میں ایک فرلانگ کا نہایت وسیع، کشادہ اور ہموار ہال بنوا دیا ہے، اور سعی میں آمد و رفت کے راستے الگ الگ کردیے ہیں، اور اب حاجی ہر موسم میں چھت کے سایہ میں سعی کرتے ہیں، ہال میں دونوں طرف دیوار میں پیتل کی نہایت خوبصورت بڑی بڑی جھنجھریاں لگی ہوئی ہیں جن سے ہوا اور روشنی آتی رہتی ہے، عنقریب پنکھے بھی لگ جائیں گے، صفا کی چوٹی پر ایک شاندار گنبد تعمیر کردیا گیا ہے جس سے

اس ہال کی عظمت اور شان اور بڑھ گئی ہے،

مسجد نبوی میں بھی اسی شان کی توسیع کی گئی ہے، لیکن ترکوں کی بنائی ہوئی مسجد کی اصل عمارت کو جو سلطان عبدالمجید المتوفی ۱۲۷۷ھ کی تعمیر کردہ ہے، بجنسہ قائم رکھا گیا ہے، اس کے باہر کے دورویہ دالانوں کو توڑ کر ان میں توسیع کی گئی ہے، ان کو طول و عرض میں بہت بڑھا دیا گیا ہے، اور مسجد کی عمارت کے سامنے صحن کو چھوڑ کر اس کے سامنے ایک بڑا کھلا ہوا دالان پھر ایک وسیع صحن چھوڑ کر ایک اور دالان بنا دیا گیا ہے، اس سے مسجد کی ملحقہ عمارتوں میں بڑی وسعت ہوگئی ہے، ان سب میں نماز ہوتی ہے، اس اضافہ کی خوبصورتی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، حرم کی عمارت میں حسن کے ساتھ شکوہ بھی ہے اور مسجد کی توسیع شدہ عمارت میں حسن کے ساتھ لطافت و نزاکت ہے،

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ گو موجودہ توسیع میں تعمیر کی ساری صناعیاں صرف کردی گئی ہیں، لیکن ترکوں کی بنائی ہوئی مسجد میں جو دلکشی اور دل آویزی ہے وہ اضافہ میں نظر نہیں آتی، اس میں عقیدت کی وہ روح ناپید ہے جس کے بغیر ایسے آثار میں کیفیت نہیں پیدا ہوتی، ممکن ہے یہ راقم کا ذاتی تاثر ہو،

شریف حسین کے زمانہ میں حرمین جو توحید کا سرچشمہ ہیں اور جہاں سے ساری دنیا میں نور توحید پھیلا، خاکم بدہن شرک و بدعت کا مرکز بن گئے تھے، سعودی حکومت نے ان کو ختم کرکے شرک و بدعت کے ہر دھبہ سے پاک کردیا، اس میں بے اعتدالیاں بھی ہوئیں جو نجدیوں کی انتہا پسندی اور شرک و بدعت کے حدود سے ناآشنائی کا نتیجہ ہیں، ایسی بدعتوں سے خود حکومت کا دامن بھی پاک نہیں ہے، اور روز بروز حکومت اور حجاز دونوں میں ایسی باتیں رائج ہوتی جاتی ہیں جو نہ صرف توحید بلکہ شرعی احکام کے بھی سراسر خلاف ہیں، مثلاً تصویر کتنی عام ہے، ملک فیصل کی تصویریں بہت سی دوکانوں بلکہ بعض سرکاری دفاتر میں بھی آویزاں ہیں، ان کی اور اسلامی حکومتوں کے سربراہوں کی آمد پر حرم تک میں ان کی تصویریں لیجاتی ہیں، اس سال بھی حالت احرام میں

ملک فیصل کی تصویر اخبارات میں شائع ہوئی تھی، اس قبیل کی اور بہت سی باتیں ہیں۔

حجاز میں دولت وثروت کے مظاہر

سرزمین حجاز نے اپنے خزانے اگل دیے ہیں، ہر طرح کے قیمتی معدنیات کی کانیں برابر نکلتی چلی آرہی ہیں، اور ریگستانِ عرب میں سونے چاندی کے دریا بہ رہے ہیں، زندگی کے ہر شعبہ میں تعمیر و ترقی کا ایک حشر برپا ہے، مکہ معظمہ خصوصاً جدہ میں جدید طرز کی ایسی ایسی شاندار عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں کہ یورپ کا کوئی ماڈرن شہر معلوم ہوتا ہے، تعمیر کا پلان یہ ہے کہ حجاز کے بڑے شہروں جدہ، مکہ، مدینہ اور طائف کو ایسا ماڈرن بنا دیا جائے کہ وہ سیاحوں کی تفریح گاہ بن جائیں۔

سعودی حکومت کے پایۂ تخت ریاض کو تو میں نے نہیں دیکھا مگر ان شہروں سے اس کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ع قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا۔ سنا ہے کہ اس کے ایوان و قصور پرانے مشرقی بادشاہوں کے محلوں کو شرماتے ہیں، جدہ کا بڑا بازار، وسعت میں نہ سہی، دوکانوں کی زینت و آرائش میں بمبئی اور کلکتہ کے بازاروں سے کم نہیں، اور سامان کی کثرت و تنوع میں ان سے بڑھ کر ہے، مکہ مدینہ کے بازار یورپ کے اعلیٰ درجہ کی مصنوعات سے پٹے پڑے ہیں، جن پر آنکھ نہیں ٹھہرتی، ان میں بہتیری مصنوعات ہندوستان میں دیکھنے کو نہ ملیں گی،

دولت خیر بھی ہے اور شر بھی، کلام مجید نے اس کو "قواماً للناس" بتایا ہے، اور "خیر" و "فضل" سے تعبیر کیا ہے، مگر اس کی محبت کی مذمت بھی ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ اگر دولت کا صحیح استعمال کیا جائے تو اس سے بہتر خیر نہیں اور اگر غلط استعمال کیا جائے تو اس سے برا شر نہیں، اس وقت سعودی حکومت اور عرب قوم دولت و ثروت کے اسی دوراہے سے گذر رہی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ ملک فیصل ایک بیدار مغز اور جمہوریت پسند فرمانروا ہیں، حکومت کی آمدنی کو قوم کی ملک سمجھتے ہیں، اور اس کا بڑا حصہ ان کی فلاح و بہبود پر صرف کر رہے ہیں اور اس زمانہ میں کسی ملک و قوم کی ترقی و استحکام کے جو ذرائع ہیں، رفتہ رفتہ ان کو اختیار کر رہے ہیں، وہ دینی جذبہ بھی رکھتے ہیں، سعودی حکومت

اسلامی دنیا میں تنہا مذہبی حکومت ہے، جہاں سب سے زیادہ اسلامی قوانین نافذ ہیں،

ایک نازک مسئلہ

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ آجکل مغربی تمدن دنیا میں اتنا چھا گیا بلکہ ہوا کی طرح سرایت کر گیا ہے کہ اس سے بچنا بہت دشوار ہے، قوموں کی ترقی اور استحکام کے لیے اس تمدن کی بہت سی چیزیں خصوصاً مغربی علوم و فنون، سائنس کی ایجادات و اختراعات اور حکومت کے اداروں کی تنظیم میں ان سے استفادہ ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی قوم اس زمانہ میں زندہ نہیں رہ سکتی لیکن اس تمدن میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اسکی بنیاد تمامتر مادیت پر ہے، اس لیے وہ اپنے ساتھ بے قید آزادی، ناخداشناسی، الحاد و بددینی، مفرط عیش و تنعم جس میں حلال و حرام کا امتیاز بھی باقی نہیں رہتا، لاتا ہے، جس سے بچنا بہت مشکل ہے، اس وقت عربوں کو بھی انہی حالات کا سامنا ہے، اس تمدن کی اندھی تقلید نے بعض اسلامی ملکوں میں جو گل کھلائے ہیں اندیشہ ہے کہ یہی صورت حال حجاز میں بھی پیش نہ آئے۔

مغربی تہذیب کے اثرات

دولت کی ریل پیل میں خاص طور سے مغربی تمدن کے اثرات سے دامن بچانا دشوار ہے، یہ اثرات حجاز میں بھی نظر آتے ہیں، لباس کے علاوہ ہر شعبۂ زندگی میں مغربی تہذیب تیزی سے پھیل رہی ہے، فوٹو تو عام چیز ہوگئی ہے، ہندوستان میں دینداری کا معیار داڑھی کا طول و عرض ہے، عرب میں داڑھی سرے سے غائب ہے، جن بوڑھوں اور دینی طبقوں کے چہروں پر داڑھی نظر بھی آتی ہے، تو صرف ٹھڈی پر سرمہ کی لکیر کی طرح جس کو داڑھی کہنا مشکل ہے، معلوم ہوتا ہے دو چار دن سے مونڈا نہیں گیا ہے، کلوں کا بالکل صفایا ہوتا ہے، یہی حال تمام اسلامی ملکوں کا ہے، حجاز میں جہاں لمبی اور گھنی داڑھی نظر آئے سمجھ لیجئے ہندوستانی ہے، لیکن انہی داڑھی منڈوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی دینی تڑپ بڑے بڑے اصحاب لحیہ کے لیے قابل رشک ہے، ریڈیو پر مصری رقاصاؤں کے گانے عام ہیں، جو ہر جگہ عرب میں بے تکلف سنے جاسکتے ہیں، شاید ہی کوئی ٹیکسی ٹرانسسٹر سے خالی ہو، عرب بے تکلف یورپ کے بند ڈبوں کا

گوشت استعمال کرتے ہیں، جو قطعاً ذبیحہ نہیں ہوتا، راقم نے ایک جگہ بہت سے چوزے پنج پر لگے ہوئے دیکھے، جماعت تبلیغی کے ایک رفیق نے بتایا کہ سب یورپ کے انڈوں (بند ڈبوں) سے نکلے ہوئے ہیں، شہری عورتوں کا لباس تقریباً مغربی ہو گیا ہے، جس پر کھلی ہوئی اور خوش رنگ موزوں سے مزین پنڈلیاں اور اونچی ایڈی کے جوتے شہادت دیتے ہیں، لیکن یہ غنیمت ہے کہ ابھی یہ زینت دائرہ انیش برقعوں کے اندر ہے، سنا ہے کہ یہ وبا شاہی محلات تک پہنچ گئی ہے، معیارِ زندگی اتنا اونچا ہو گیا ہے کہ ہم غریب ہندوستانی اس کا قیاس بھی نہیں کر سکتے، موٹروں کی دوڑ ریل پیل ہے کہ راستہ چلنا دشوار ہوتا ہے، وہاں ٹیکسیاں ایسی اعلیٰ درجہ کی ہیں کہ ہندوستانی امرا کو ایسی کاریں نصیب نہیں، مگر معلوم ہوا کہ یہ "ترقی" شہری زندگی تک محدود ہے، دیہاتوں کے عرب اب تک عربی تہذیب و معاشرت اور عربی اخلاق پر قائم ہیں، اندیشہ ہے کہ تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ یہ بلا دیہاتوں میں بھی نہ پھیل جائے، درحقیقت یہ بڑا مشکل اور عالمگیر مسئلہ ہے اور اس کا حل دشوار نظر آتا ہے، اگر مغربی علوم و فنون اور سائنس کی ایجادات و اختراعات سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو اس زمانہ میں جینا مشکل ہے اور ان کو اختیار کیا جائے تو اس کے اثرات اور لوازم سے دامن بچانا دشوار

غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را

بلائے الفتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

اس دور کا سب سے بڑا مصلح وہی ہو گا جو اعتدال کی ایسی صراطِ مستقیم نکالے گا جس میں نہ جامِ شریعت ہاتھ سے چھوٹنے پائے اور نہ سندانِ مغرب کی چوٹ سے جامِ شریعت کو صدمہ پہنچے، عام طور سے دین کا کوئی اہتمام نہیں، حتیٰ کہ حرم تک میں اس کے اثرات نظر آتے ہیں، یہ تنہا عربوں کا حال نہیں ہے، سارے اسلامی ممالک اس بلا میں مبتلا ہیں، ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں تڑپے ہے مرغ قبلہ نما "آشیانے میں

جن کے ہاتھ میں حکومت اور دولت آتی ہے، وہ آنکھ بند کر کے مغرب کی نکالی ہوئی شاہراہ پر چل پڑتے ہیں، عربوں اور اسلامی ملکوں کا کیا شکوہ، ان کے پاس دولت بھی ہے اور حکومت و اقتدار بھی، ہم ہندوستانی مسلمانوں کا قدم، جو دولت اور حکومت دونوں سے محروم ہیں، اس راہ میں کب ان سے پیچھے ہے، عربوں خصوصاً حجاز کو اس رنگ میں دیکھ کر اس لیے تکلیف ہوتی ہے کہ وہ اسلام کا مرکز ہے، یہیں سے اسلام کا سرچشمہ پھوٹا، اسلام کے اولین حامل و مبلغ وہی تھے، ان ہی کے ذریعہ یہ دولت ساری دنیا میں پھیلی، اس لیے اگر وہ بگڑ گئے تو پھر دوسری مسلمان قوموں سے کیا امید کی جا سکتی ہے۔ ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا باشد مسلمانی

ملک فیصل کا دینی جذبہ اور بیدار مغزی

لیکن دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں سعودی حکومت اب بھی بہت غنیمت ہے، اس کا مذہب اسلام ہے، اور اس کا قانون بڑی حد تک اسلامی ہے، ملک فیصل اسلامی جذبات اور اسلام اور مسلمانوں کا درد رکھتے ہیں، اور عملاً بھی ان کی فلاح و سربلندی کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے، ان کی کوششوں کو کامیاب فرمائے، اور حجاز کو مغربی تہذیب کے برے اثرات و نتائج سے محفوظ رکھے،

حجاز میں بظاہر بڑی فارغ البالی ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں دولت اور ثروت کے مظاہر نظر آتے ہیں، معیارِ زندگی بہت بلند ہو گیا ہے، بازار یورپ و امریکہ اور چین و جاپان کے بہترین سامانوں سے پٹے ہوئے ہیں، جو ہندوستان میں ناپید اور یہاں کے مقابلہ میں بہت ارزاں ہیں، لیکن سب بیرونی ملکوں کی مصنوعات ہیں، اس وقت عربوں کی زندگی بلکہ غذا تک کا دارومدار بیرونی ملکوں پر ہے، دودھ اور انڈے تک باہر سے لے آتے ہیں، اس لیے یہ دولت پائیدار نہیں، تیل کی رائلٹی سے جو دولت آتی ہے، اس کا بڑا حصہ زندگی کے تکلفات میں پھر باہر چلا جاتا ہے،

لیکن اب حکومت شاہ فیصل کے ہاتھوں میں آئی ہے، جو بیدار مغز اور ترقی پسند حکمراں ہیں،

وہ حکومت کی دولت کو قوم کی ملک سمجھتے ہیں، چنانچہ اس کا معتد بہ حصہ ملک کی تعمیر و ترقی میں صرف ہو رہا ہے، عام تعلیم، سائنس، انجینیرنگ، ٹکنالوجی، ڈاکٹری اور صنعت و حرفت وغیرہ کی طرف ان کی خاص توجہ ہے، اور ریاض میں ان سب کے کالج اور یونیورسٹی اور حجاز کے مختلف حصوں میں صنعت و حرفت کے مختلف کارخانے قائم ہوگئے ہیں، عرب طلبہ بیرونی ملکوں میں تعلیم کے لیے بھیجے جا رہے ہیں، اس لیے امید ہے کہ چند برسوں کے بعد یہ صورت حال نہ رہے گی، اور سعودی حکومت بہت سی چیزوں میں خود کفیل ہوجائے گی، اس کو دوسرے ملکوں کی احتیاج باقی نہ رہے گی،

حرم میں بعض ناپسندیدہ باتیں

سعودی حکومت نے حرم میں بعض ایسی اصلاحات کی ہیں جن پر اگرچہ بعض طبقوں کو اعتراض ہو لیکن اصولاً وہ مناسب ہیں، مثلاً اس نے چاروں مصلوں کو ایک کر دیا ہے، یہاں تک کوئی مضائقہ نہیں تھا، حرم میں اس قسم کی تفریق پسندیدہ نہیں تھی، اس لیے یہ اصلاح بہت موزوں و مناسب ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کرنا چاہیے تھا کہ ایک ایک وقت چاروں مذاہب کے امام نماز پڑھاتے، حنبلی امام کا امتیاز اس طرح قائم رہتا کہ وہ دو وقت کی نماز پڑھاتا، لیکن غالباً صرف ایک وقت شافعی امام نماز پڑھاتا ہے، باقی چار اوقات میں حنبلی امام، حنفی امام کی کوئی جگہ نہیں ہے، معتبر لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ حنفیوں سے بڑا تعصب ہے، اس کے بعض ذاتی تجربات و مشاہدات بھی ہوئے، حرم میں ہر مسلک کے علماء وعظ کہتے ہیں، عموماً یہ وعظ دینی ہوتے ہیں، لیکن حنبلی واعظ علانیہ حنفی مذہب کی مذمت کرتے ہیں، اور حضرت امام ابو حنیفہؒ تک کو نہیں چھوڑتے، سنا ہے کہ اس تعصب کو بھڑکانے میں ہندوستان کے برادران اہلحدیث کا بڑا ہاتھ ہے، ان کے واعظ احناف پر طعن و طنز کرتے رہتے ہیں، ایک دن خود راقم نے ایک ہندوستانی اہلحدیث مولوی صاحب کو بڑے ناپسندیدہ الفاظ میں تقلید کی مذمت کرتے ہوئے سنا جو احناف پر صریح چوٹ تھی، حرم دینی وعظ کی جگہ ہے، اس میں تقلید و عدم تقلید کا کیا موقع ہے، بدعات کی مخالفت شوق سے کیجائے، حنفی خود اس کے مخالف ہیں، لیکن اس لپیٹ میں حنفی مسلک کو گھسیٹنا کونسی دینی خدمت ہے،

خود نجدی امام احمد بن حنبل کے مقلد ہیں، یہ اور بات ہے کہ بعض عقائد میں اشتراک کی بنا پر ان میں اور اہلحدیث میں اتحاد ہوگیا ہے، تقلید سے تو اہلحدیث بھی خالی نہیں، تقلید کے معنی شرعی مسائل میں ذاتی تحقیق کے بغیر اسلاف کی تحقیقات پر اعتماد اور ان کا اتباع ہے، اس اعتبار سے اہلحدیث کی بڑی تعداد مقلد ہے، ان میں سے کتنے ایسے ہیں جن میں ذاتی تحقیق کی صلاحیت ہے، ائمہ اربعہ کے مقلد نہ سہی اپنے علماء کے سہی،

حرم دنیا کے سارے مسلمانوں کی مشترک میراث ہے، اس پر سب کا حق برابر ہے، سعودی حکومت صرف اس کی خادم ہے، اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ حرم پر سارے مسلمانوں کے حقوق کا لحاظ رکھے، اور یہاں اس قسم کی تفریق انگیز باتوں کی اجازت نہ دے، ملک فیصل اسلامی اتحاد کے داعی بھی ہیں، اس لیے ان پر اس کی اور بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے،

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

راقم خود کسی اہل علم کے لیے تقلید جامد کو پسند نہیں کرتا، لیکن اس کی بنا پر احناف کو مورد طعن بنانا اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ ہے، اس قسم کے اختلافی مسئلوں میں پڑنا ہمارے مسلک کے خلاف ہے، اور بہت سے اہلحدیث حضرات سے بھی ہمارے تعلقات ہیں، لیکن حرم میں جو صورت دیکھی اس سے تکلیف ہوئی اور بغرض اصلاح یہ سطریں قلم سے نکل گئیں،

اس موقع پر مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی مرحوم کا ایک واقعہ یاد آگیا، عرصہ ہوا ایک مرتبہ وہ اہل حدیث کی کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے مئو آئے تھے، واپسی میں دار المصنفین تشریف لائے، ایک صحبت میں احناف اور اہل حدیث کے اختلاف اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں بعض متشدد اہل حدیث حضرات کی گستاخیوں کا ذکر آگیا، اس کو سنکر مولانا کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور فرمایا کہ ہم لوگ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی جوتیوں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں،

امت پر ان کے بڑے احسانات ہیں، جو لوگ ان کی شان میں نازیبا کلمات استعمال کرتے ہیں وہ سخت گستاخ ہیں، اس واقعہ سے اس قسم کے حضرات کو سبق لینا چاہیے،

خانۂ کعبہ کی حاضری اور اس کے کوائف و تاثرات

حرم کعبہ میں داخلہ کے وقت دل پر جو واردات اور کیفیتیں طاری ہوتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان ایسے معاملات ہیں جن کی نزاکت شرح و بیان کی متحمل نہیں، پھر ہر شخص کے ساتھ معاملہ جدا ہوتا ہے، اور اس کی کیفیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں، لیکن بالعموم حرم شریف میں داخلہ اور بیت اللہ پر پہلی نظر پڑتے وقت ہر مسلمان کا دل اس کی عظمت و ہیبت اور اپنے گناہوں کے احساس سے لرز اٹھتا ہے، اس کی طرف قدم بڑھانے بلکہ نظر اٹھانے کی ہمت نہیں پڑتی، اپنی بد اعمالیوں کا جتنا شدید احساس حرم شریف میں پہلی حاضری کے وقت ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا، سارے گناہ مجسم شکل میں نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خانۂ کعبہ ایک مجلی آئینہ ہے جس کے سامنے ہر انسان کی اصلی تصویر نظر آجاتی ہے، اور اپنے سراپا گناہ وجود سے حرم پاک کی زمین کو آلودہ کرتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کی طرف قدم نہیں اٹھتے، لیکن اللہ تعالیٰ مغفرت ہی کیلئے اپنے آستانہ پر بلاتا ہے، اس لیے وہی تسلی کا سامان بھی فرماتا ہے، گناہوں سے مغفرت کا وعدہ یاد آجاتا ہے

یَاعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ	اے میرے بندو جنھوں نے (گناہ کرکے) اپنے
لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ	اوپر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو،
یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا، اِنَّهٗ هُوَ	بیشک اللہ سارے گناہوں کو معاف کرتا ہے
الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ	اور وہی معاف کرنے والا مہربان ہے،

اس نے تو رحمت اپنے اوپر لازم کرلی ہے.

کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ	تمھارے رب نے اپنے اوپر رحمت لازم کرلی ہے،

معمار کعبہ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی تو یہ خاص دعا ہے،

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ	اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو امن کا شہر بنا اور
ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ	اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے روزی دے،

یہ دعا کس طرح نامقبول رہتی، چنانچہ خدا نے بیت اللہ کو گناہگاروں کے لیے پناہ گاہ قرار دیا، اور وعدہ فرمایا کہ

وَمَنْ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا	جو شخص اس گھر میں داخل ہوگا وہ ہر گزند سے محفوظ ہے،

اس لیے کوئی گنہگار اس در سے مایوس کیسے لوٹ سکتا ہے، اس سے دل کو ڈھارس بندھتی ہے اور وہ زبان حال سے یہ اشعار

بر در آمد بندۂ بگریختہ	آبروئے خود ز عصیاں ریختہ
اے لطف تو دستگیر ہر خود رائے	وے عفو تو پردہ پوش ہر رسوائے
بخشائے بر آں کسے کہ اندر ہمہ عمر	جز درگہ تو ہیچ ندارد جائے
اے بدرماندگی پناہ ہمہ	کرم تست عذر خواہ ہمہ.
خسرو از تو پناہ می جوید	اے پناہ من و پناہ ہمہ

پڑھتا ہوا آگے بڑھتا ہے، اس التجا و زاری کو سنکر خود رحمت الٰہی دستگیری کرتی ہے، مغفرت کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، اور خانہ کعبہ کے والہانہ طواف، ملتزم شریف پر دل کی بیقراری، آنکھوں کی گریہ زاری باب کعبہ پر جبیں سائی سے دل کی کیفیت بدلنے لگتی ہے، مایوسی کے تاریک بادل چھٹ جاتے ہیں، رحمت و مغفرت کے دروازے کھلنے لگتے ہیں اور یہ یقین ہوجاتا ہے کہ اس در سے کبھی کوئی بھکاری نامراد نہیں لوٹا، اور وہ مغفرت کا یقین لیکر مطمئن و مسرور لوٹتا ہے،

اور یہ شاعری حق الیقین بنجاتی ہے،

این درگہ ما درگہ نومیدی نیست   صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

خانہ کعبہ کے گرد عجیب کیفیت ہوتی ہے، کوئی ملتزم شریف سے چمٹا ہوا رو رہا ہے، کوئی چوکھٹ کو پکڑے بلبلا رہا ہے، کوئی کعبہ کے درو دیوار پر سر رگڑ کر آنسو بہا رہا ہے، کوئی غلاف کعبہ کو آنکھوں سے مل رہا ہے، ہر شخص اپنے حال میں مبتلا ہے، ان میں سے ہر جگہ توبہ قبول ہوتی ہے، مغفرت کے پروانے ملتے ہیں، گناہوں کی بخشش ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رحمت و مغفرت کی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے، اور گنہگار اس میں نہا کر اپنے گناہوں کو دھو رہے ہیں، یہ شاعری نہیں بلکہ حقیقت ہے، صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ حج مبرور کے بعد سارے گناہ دھل جاتے ہیں بشرطیکہ توبہ توبۃ النصوح ہو اور آیندہ زندگی بدل جائے، یہ نہیں کہ حج کے ذریعہ پرانا حساب وکتاب بے باق کر کے نیا کھاتہ کھول دیا، حج مبرور کی علامت یہ ہے کہ پھر حتی الامکان بد اعمالیوں سے دامن بچا رہے،

طواف کا منظر طواف کعبہ کا منظر بھی عجیب ہوتا ہے، رات دن ہزاروں لاکھوں انسان دیوانہ وار اس کا چکر لگاتے رہتے ہیں، زبان مصروف دعا ہے اور قدم کعبہ کے گرد رواں دواں، ان میں سلاطین و امرا بھی ہوتے ہیں اور گدائے بے نوا بھی، صلحاء و اخیار بھی ہوتے ہیں اور طالب مغفرت فساق و فجار بھی، بڑے بڑے علماء اور اہل علم بھی ہوتے ہیں اور ناخواندہ جاہل بھی، عورتیں بھی ہوتی ہیں مرد بھی، بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور جوان بھی، اور حج کے ایام میں ان کا لباس بھی عاشقانہ ہوتا ہے، جسم پر ایک بے سلی تہمد ہوتی ہے اور کندھوں پر بے سلی چادر، اس لباس میں ایک خاص کیفیت ہوتی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے،

خانہ کعبہ میں اسلام کی عالمگیریت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، جہاں مختلف ملکوں، مختلف قوموں، مختلف نسلوں، مختلف رنگ و روپ، مختلف زبانوں اور مختلف وضع قطع کے لوگ ایک لباس، ایک رنگ اور ایک کیفیت میں سرشار نظر آتے ہیں جس کی نظیر دنیا کے کسی خطہ میں نہیں مل سکتی، اس سلسلہ میں ایک بات جو ابتک دل میں کھٹک رہی ہے، لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، عورتوں اور مردوں

کے مخلوط طواف کی روایت اگرچہ ہمیشہ سے چلی آرہی ہے، لیکن اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے قابل اصلاح ہے، مردوں اور عورتوں کی ریل پیل ایسی ایک ساتھ ہوتی ہے کہ عورتوں کے ہجوم سے بچنا مشکل ہوتا ہے، اگر ان دونوں کے طواف کے اوقات الگ الگ مقرر کر دیے جائیں یا مطاف میں دونوں کے طواف کا دائرہ الگ کر دیا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے، دوسری صورت میں حجر اسود کے بوسہ کا مسئلہ اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ باری باری سے دونوں دائروں پر مرد اور عورتیں طواف کریں، اس طرح دونوں کو حجر اسود کے بوسہ کا موقع مل جائے گا، حجر اسود کے بوسہ کے لیے اتنا ہجوم اور اتنی کشمکش ہوتی ہے کہ ایک دوسرے پر ریلا پڑتا ہے، جو شرعی حکم کے سراسر خلاف ہے، ایسی صورت میں استلام پر اکتفا کرنا چاہیے، راقم بیشتر اسی پر عمل کرتا تھا، مگر الحمد للہ اس احتیاط کے باوجود کئی مرتبہ بوسہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی،

زمزم زمزم کا کنواں ایک زندہ معجزہ ہے، یہ متوسط حجم کا کنواں ہے، حج کے زمانہ میں لاکھوں انسان اسکا پانی پیتے ہیں، نماز کے اوقات میں اس سے وضو کرتے ہیں، بعض نہاتے بھی ہیں یا کم از کم تبرکاً اپنے اوپر ڈال لیتے ہیں، ہر حاجی آب زمزم کے کنستر بھروا کر اپنے ساتھ لیجاتا ہے، اس کے باوجود پانی میں کمی نہیں آتی، حالانکہ پانی کے اتنے صرف کے لیے بڑے بڑے اندارے اور باولیاں بھی ناکافی ہیں،

زمزم کے پانی کی حدیثوں میں بڑی فضیلت آئی ہے، اس کو امراض کے لیے شفا قرار دیا گیا ہے، واقعات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اور آج بھی اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، خود مدحت کامل صاحب قدوائی نے جو نئے زمانہ کے تعلیم یافتہ، روشن خیال آدمی ہیں، اس قسم کے کئی چشم دید واقعات مجھ سے بیان کیے، جنکو سنکر حیرت ہوئی، کیمیاوی تحلیل سے بھی اس کی تصدیق ہو چکی ہے کہ زمزم کے پانی میں بہت سے شفا بخش اجزاء ہیں،

منیٰ، عرفات اور مزدلفہ خانہ کعبہ کے بعد منیٰ، عرفات اور مزدلفہ انوار الٰہی کا مہبط اور دعا و مناجات کے خاص مقامات ہیں، اس لیے خانہ کعبہ کے طواف اور صفا و مروہ کی سعی کے بعد حج کے دوسرے مناسک انہی تینوں مقامات

تیں ادا کیے جاتے ہیں، انکا قیام، وقوف، رمی جمار، قربانی، حلق راس اور عبادت و ریاضت وغیرہ ارکانِ حج میں ہیں، عرفات کا وقوف سب سے بڑا رکن ہے، اس کے بغیر حج نہیں ہوتا، ۸ ذی الحجہ سے لیکر ۱۲ تک ان مقامات میں مسلسل کوچ و قیام کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور اس شعر کی تصویر نگاہ کے سامنے آجاتی ہے۔

طلب تمام ہو مطلوب کی اگر حد ہو
لگا ہوا ہے یہاں کوچ ہر مقام کے بعد

یہ تینوں مقامات مکہ معظمہ سے پانچ چھ میل سے لیکر دس بارہ میل کے حلقہ میں ہیں، پہلے یہ سب کھلے میدان تھے، اب منیٰ میں بہت سی عمارتیں بن گئی ہیں، مگر اسکا بڑا حصہ میدان ہی ہے، جہاں حج کے ایام میں خیموں کا پورا شہر آباد ہو جاتا ہے،

بعض قابل توجہ مسائل | قربانی کے سلسلہ میں کئی چیزیں قابل اصلاح ہیں، جنکی جانب فوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے، قربانی کھلے میدان میں ہوتی ہے، جہاں دھوپ سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں، حجاج کو جانوروں کی خریداری اور قربانی کیلئے گھنٹوں دھوپ میں کھڑا رہنا پڑتا ہے، کوئی باقاعدہ قربانگاہ نہیں ہے، جگہ جگہ قربانی ہوتی ہے، اس لیے حجاج کو مردہ جانوروں کی لاشوں اور انکے خون اور آلائش کو روندتے ہوئے جانا پڑتا ہے، کپڑے ان میں لت پت ہو جاتے ہیں، جنکا تحمل ہر شخص نہیں کر سکتا، اسلیے ضرورت ہے کہ قربانگاہ کے میدان میں دھوپ سے بچنے کیلئے بڑے بڑے سائبان بنوا دیے جائیں، اور ایسی وسیع، کشادہ اور پختہ قربانگاہیں بنا دیجائیں کہ خون اور آلائش جمع نہ ہو سکے، قربانگاہ تک پہنچنے کیلیے پختہ راستے بنوا دیے جائیں جنکے پاس قربانی کرنیکی ممانعت ہو، یہ غنیمت ہے کہ مکہ کی آب و ہوا خشک ہے، مردہ جانوروں کی لاشیں سڑتی نہیں بلکہ خشک ہو جاتی ہیں، ورنہ انکے تعفن سے ہر سال وبائی امراض کا خطرہ رہتا، پھر بھی حفظان صحت کے لیے خاص انتظامات کی ضرورت ہے،

اس سے بھی بڑا مسئلہ لاکھوں جانوروں کی اضاعت کا ہے، قربانی کرنے والے اپنی قربانی کا بمشکل سیر دو سیر گوشت لیتے ہیں، باقی لاکھوں ذبح شدہ جانور خندقوں میں دفن کر دیے جاتے ہیں جن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا اور کروڑوں روپئے کا نقصان ہوتا ہے، اگر حکومت توجہ کرے تو قربانی کے جانوروں کے گوشت، ہڈی اور کھال سب کو کام میں لایا جا سکتا ہے، گوشت کو ڈبوں میں بند کرکے دوسرے ملکوں کو سپلائی کیا جا سکتا ہے، اس طریقے سے

اگر منیٰ یا مکہ میں دباغت کے کارخانے قائم کر دیے جائیں تو کروروں روپئے سالانہ کی کھالیں فروخت ہو سکتی ہیں، بلکہ خود حجاز میں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اگر چرمی سامان بنانے کے کارخانے حجاز میں قائم کر دیے جائیں تو اس سے صنعت و حرفت کو بھی فروغ ہوگا، اور آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ پیدا ہو جائیگا، اس سے جو آمدنی ہو اس میں مصارف نکال کر باقی آمدنی غربا، و مساکین پر صرف کیجائے، اس طرح قربانی کا مصرف بھی قائم رہیگا اور اس کا گوشت اور کھالیں بھی بیکار ضائع نہ ہوں گی، اس مسئلہ کا حل اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ صورت حال کو دیکھکر ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو سرے سے قربانی کو غیر ضروری سمجھنے لگا ہے، اسکے بجائے قربانی کی نقد قیمت کو صدقہ کرنے کو ترجیح دیتا ہے، اگر اس قسم کے مسائل حل نہ کیے گئے تو ایک دن یہ ہو کر رہیگا۔ دوسرا مسئلہ رمی جمرات کا ہے، اس میں اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ اگر آدمی توانا اور مضبوط نہ ہو تو اس کے پس جانے کا خطرہ رہتا ہے، اگر مضبوط سے مضبوط آدمی کے قدم مجمع میں اکھڑ جائیں یا وہ گر پڑے تو پھر اس کا زندہ اٹھنا ناممکن ہے، خصوصاً جمرۂ اولیٰ اور جمرۂ وسطیٰ میں جگہ بہت تنگ ہے، آنے جانے والوں کے راستے بھی جدا نہیں ہیں، اسلیے ان دونوں میں اور بھی کشمکش ہوتی ہے، اسلیے ضرورت اسکی ہے کہ اسکے ہر طرف میدان وسیع کیا جائے اور آنے جانے کیلئے راستے جدا کر دیے جائیں، مجمع میں نظم کو قائم رکھنے کیلئے پولیس کا خاص انتظام کیا جائے، اس سے کچھ سہولت ہو جائیگی، ورنہ موجودہ شکل میں تو جہاں قدم ٹکانا مشکل ہو، رمی جمرات کی صحیح اور مسنون طریقہ سے ادائیگی کا کیا سوال، عورتوں کے اوقات اب بھی الگ ہیں لیکن اسکی پوری پوری پابندی نہیں ہوتی ہے، سختی سے عمل کرانے کی ضرورت ہے۔

مکہ معظمہ کے آثار و مشاہد | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے ابتدائی ۱۳ سال مکہ معظمہ میں بسر فرمائے، اسلیے یہاں اس عہد کے چند آثار ہیں، غار حرا جسمیں حضورؐ نبوت سے پہلے مراقبہ اور ذکر و فکر فرمایا کرتے تھے، غار ثور جسمیں ہجرت کے وقت کفار مکہ کے تعاقب سے بچنے کیلئے استراحت فرمائی تھی، جبل رحمت، یہ مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے، جنت المعلیٰ، جہاں بعض نامور ہستیاں اور بہت سے صلحا و اخیار امت آرام فرما ہیں، غار ثور اور غار حرا پہاڑ کی بلندی پر ہیں، ان پر چڑھنے کی ہمت نہیں تھی، دور ہی سے انکی زیارت کر لی، جبل رحمت زیادہ بلند نہیں ہے، اس پر چڑھنے کیلیے سیڑھیاں بھی بنی ہوئی ہیں، مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اس پر بھی نہ چڑھ سکا، اسکے نیچے سے دعا خیر کر لی، مولد نبوی صفا کے اوپر والی سڑک پر ہے، اب یہاں ایک عمارت میں مکتبہ قائم ہے،

جنت المعلیٰ دو مرتبہ حاضری ہوئی، یہ ایک وسیع قبرستان ہے، جسکے درمیان سے اب سڑک نکل گئی ہے، اور قبرستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے، دونوں کے گرد چہار دیواری ہے، جو حصہ داہنے ہاتھ پڑتا ہے جسمیں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا مزار ہے، ناہموار زمین پتھروں کے ڈھیر اور شکستہ قبروں کا ایک خرابہ ہے، اسمیں معلوم نہیں کیسی کیسی ہستیاں آسودۂ خواب ہیں جنکی قبروں کا اب نشان تک باقی نہیں ہے، کہیں کہیں بعض شکستہ قبروں کے نشانات ٹوٹے پھوٹے پتھروں کی شکل میں نظر آتے ہیں، پھاٹک سے نیچے اترنے کے بعد تھوڑی بلندی پر شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ اور اس عہد کے بعض دوسرے بزرگوں کے مزارات بلکہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کی شکل میں اسکے نشانات ہیں، اس سے آگے بڑھکر بلندی پر ایک صاف ستھرے احاطہ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ استراحت فرما ہیں، یہ اچھی حالت میں ہے، میری حاضری کے وقت اس پر کسی نے ایک میلی سی چادر بھی چڑھادی تھی، ان سب پر فاتحہ پڑھا، اسکے آگے اور بلندی پر کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد کی قبریں ہیں،

قبرستان کا دوسرا حصہ جو سڑک کے دوسرے جانب ہے بہت اچھی حالت میں ہے، اسکے گرد بھی وسیع چہار دیواری ہے، زمین کا فرش پختہ ہے، صفائی کا بھی انتظام ہے، ممتاز شخصیتوں کے مزارات چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے احاطوں میں ہیں، ایک احاطہ میں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور انکی والدہ محترمہ حضرت اسماءؓ کا مزار اور ایک کنارہ پر ملا علی قاریؒ کی قبر بتائی جاتی ہے، اور کسی قبر کے مکین کا پتہ نہ چل سکا، معلوم قبروں پر فاتحہ پڑھا، اہل مکہ کا موجودہ قبرستان یہی ہے، قبرستان کے درمیان جو سڑک نکلی ہے آگے چل کر اس سڑک پر حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کی قبر تھی، جو اب سڑک میں آگئی ہے،

مکہ کے چند میل کے فاصلہ پر ایک مقام شہداء کہلاتا ہے، اس کے قریب حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا مزار ہے، جو اب ایک مکان کے احاطہ میں آگیا ہے، میں مغرب کے قریب فاتحہ خوانی کے لیے گیا تھا، اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا، زینہ پر چڑھ کر دیکھا تو چند شکستہ پتھروں کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا، انہی پر فاتحہ پڑھ لیا، بیعت عقبۂ اولیٰ کی جگہ ایک مسجد ہے، یہ مقام ہر طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، اس مسجد کی بھی زیارت ہوئی، دو رکعت نماز پڑھی، ان کے علاوہ اور بھی آثار ہیں مگر ان کی زیارت نہ ہوسکی۔

(باقی)

غنی کشمیری

از جناب علی جواد صاحب زیدی

(۳)

دوسرے معاصرین

غنی کا دور ہندوستان بالخصوص کشمیر میں شعر و شاعری کے اعتبار سے بہت زرخیز تھا، یہ جہانگیر اور شاہجہاں کا دور تھا، یہ دونوں بادشاہ کشمیر کی متعدد سیاحتوں کے دوران بہت سے فارسی شعرا کو بھی اپنے ساتھ کشمیر لائے، ان میں قدسی اور کلیم خصوصیت سے مشہور ہیں، ان کے علاوہ میر الٰہی ہمدانی، شیدا، حسن بیگ رفیع، محمد قلی سلیم، طغری مشہدی، مرزا محمد طاہر آشنا، ظفر خاں احسن بھی فنی اہمیت کے حامل تھے، ان میں سے کئی ایک کئی سال تک کشمیر میں رہے، اور بعض تو یہیں آسودۂ خاک بھی ہوئے، اہالیان کشمیر میں بھی حاجی محمد اسلم، سالم، محمد رفیع منشی، بستلی، عبد الرسول استغنا، قاضی ابو القاسم، ملا محمد صالح ندیم، گویا، جویا، فصیحی، فہمی، فطرتی، مشتری، بدیعی، فروغی عہد شاہجہانی وابتدائے عہد عالمگیری میں نامور ہوئے، تذکرہ نویسوں نے عام معاصرین سے غنی کے روابط کے بارے میں کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے، لیکن خود غنی نے اپنے کئی اشعار میں ایسے معاصرین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے غنی پر حسد کیا، اور آمادۂ عناد ہوئے، وہ خود خانہ نشین اور دنیا سے گریزاں تھے، ان کا شمار پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالنے والوں میں بھی نہیں ہو سکتا تھا، لیکن ان کی شہرت بھی بعضوں کو ناگوار گزرتی تھی اور لوگ ان سے آمادۂ جنگ بھی ہو جایا کرتے تھے۔

چوں نیست در افتادگیم کس را شک   برخاستہ از چہ رو بجنگم ہر کس

لوگ ان کے منہ پر بھی ان سے الجھ جاتے تھے، لیکن ایسے حضرات کا وہ خاموشی سے جواب دیتے تھے،

چراغِ مجلسم نبود مرا تاب جدل باکس
اگر در پیش من دم میزنی خاموش میگردم

اپنے معاصرین کی جس حرکت سے غنیؔ کو سب سے زیادہ تکلیف پہنچتی تھی وہ مضامین کی چوری تھی، اور اس کی طرف انھوں نے کئی شعروں میں اشارے کیے ہیں، اور کہیں کہیں تو مضمون دزدوں کی کھلم کھلا خبر بھی لی ہے ؎

بہ بزمِ نکتہ سنجاں سرخروی از سخن دارم
پر در نگم چو دزدے معنی رنگین برد از من[1]

ز مضمون دزدی یاراں نمی باشد غمے مارا
چناں بستیم مضموں راکہ نتواند کسی بردن

دیدم کہ نکتہ سنجاں دزدند شعر مردم
من نیز شعر خود را دزدیم از حریفاں

گر سخن از خود نداری بہ کہ بربندی زباں
تا بکی چوں خامہ رانی حرفِ مردم بر زباں

طبعِ آں شاعر کہ شد با طرزِ دزدی آشنا
معنی بیگانہ داند معنیِ بیگانہ را

وہد کے در حصارِ خط نہ دزداں معنیِ روشن
کجا مہر از کلف محفوظ دارد خرمنِ مہ را

بستہ شد ہر چند در یک بحر معنی ہائے تو
معنی مردم حباب و معنی من گوہر است

رسوا شود کسے کہ سخن چیں بود غنیؔ
ہر جا کہ خامہ ایست زبانش بریدنیست

ز شعرِ من دگراں کامیاب من محروم
زباں ز گوش کجا لذتِ سخن یابد

یاراں بردند شعر ما را
افسوس کہ نامِ ما نبردند

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ نہ صرف یہ کہ غنیؔ کے مضامین کی چوری کرتے تھے بلکہ برسر بزم انہی کے سامنے یہ مسروقہ مضامین سناتے تھے، اگرچہ غنیؔ کے یہاں بندش کی چستی اور ایک تازگی تھی، جو دوسروں کو نصیب نہ تھی تاہم اہل نظر فرق کو محسوس کر ہی لیا کرتے تھے، پھر بھی غنیؔ ان چوریوں سے

[1] ایک نسخہ میں دوسرا مصرعہ یوں درج ہے:۔ ع پر در نگم اگر دزدے بجو مضمون رنگینم

بیحد عاجز تھے، سخن چینی کے ساتھ بے جا خوردہ گیری کرنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی، اگرچہ آخر کار یہ لوگ منہ کی کھاتے تھے، لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے تھے، کچھ ہم عصر ایسے بھی تھے جو غنیؔ کے اشعار کو اپنا تے اور اس سے فائدے حاصل کرتے اور خود بیچارے غنیؔ محروم رہتے، بعض اوقات دوستوں کی بھری محفل میں کوئی اعتراض کر دیتا، غنیؔ کی طبیعت چونکہ بحث و تکرار اور جنگ و جدل سے گریزاں تھی اسلیے وہ خاموشی اختیار کر لیتے، لیکن ایسی خاموشی کا رواج شاعروں میں نہیں تھا، وہاں تو فوری جواب ضروری تھا، لوگ ان کی خاموشی کے غلط معنی پہناتے اور اسے ان کی شکست و عاجزی سے تعبیر کرتے تھے، چنانچہ ایک شعر میں انھوں نے اس کا بھی ذکر کیا ہے ؎

شد روشنم از شمع کہ در مجلسِ احباب
خاموش شدن مرگ بود اہلِ زباں را

کسی تذکرہ نویس نے ان باتوں کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے، اس لیے بتانا مشکل ہے کہ اعتراضات کی نوعیت کیا تھی، لیکن ان کی حیثیت یقیناً کج بحثی کی ہی ہوگی، کیونکہ غنیؔ دخل جائز کے خلاف نہیں تھے،

بحث کج در طبعِ شاعر می خلد نے دخل راست
طاقتِ خار است ماہی را و تابِ شست نیست

کچھ غنیؔ کے مقابلے میں دعوائے سخن کرتے تھے، ان کے دیوان میں ایسی رباعیاں اور اشعار موجود ہیں، جن میں انھوں نے ایسے لوگوں کو سختی سے جھڑکا ہے ؎

گر رتبہ شعر خود بپرسی از من
گویم سخنی با تو مرنجی از من

بر ہر ورقی کہ کردہ مشق سخن
چوں لوح زباں بشوی از آب دہن

بی چشم اگر چشم بدوزد بکتاب
نتواں دیدہ روئی معنی در خواب

کے غور کنند در سخن بے مغزاں
غواصی بحر نیست مقدورِ حباب

خام گویاں لبکہ می سازند معنیہا شہید
شد زمینِ شعر آخر چوں زمینِ کربلا

نمی شود سخن پست فطرتاں مشہور
بلند نیست صدا کاسۂ سفالی را

ز بے مغزان نیاید غور در بحرِ سخن کردن
سرِ بے مغز در معنی کدوی خشک را ماند

لاف موزونی زند مانندِ سرو
ہر کہ خواند صفحۂ از بوستاں

چو استعداد نبود کار از اعجاز نکشاید
مسیحا کے تواند کرد روشن چشم سوزن را

بعض اشعار میں غنیؔ نے حاسدین ہمعصر پر طنز بھی کیا ہے ؎

ہر چند غنیؔ ہیچ نگیں خانہ نشین است
نامش زد ربستہ بر آید چہ تواں کرد

غنی پر سرقہ کا الزام وہی غنی جو کسی دوسرے کے مضمون کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا حرام سمجھتے تھے، اور اس کا علی الاعلان ذکر کیا کرتے تھے، جو کبھی کسی کے مضمون کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے، انہی پر بعض معاصرین نے سرقہ کا الزام لگایا، ایک رباعی میں انھوں نے خاص طور سے طغرا کا نام لیا ہے غالباً یہ ان کے ہمعصر ملا طغرائے مشہدی ہیں، جو اعلیٰ نثار اور خوش گو شاعر گزرے ہیں، یہ شاہجہاں کے بیٹے مراد بخش کے دربار سے وابستہ تھے، اور کشمیر میں وفات پائی[1]، طغرا نے ان پر مضامین کی چوری کا الزام لگایا، اور غنیؔ نے جل بھن کر یہ رباعی لکھ دی ؎

طغرا کہ بود روح کثیفش چو جسد
با صاف ضمیر ار شدہ دشمن ز حسد

گوید کہ برند شعرش ارباب سخن
نامش نبرند تا بشعرش چہ رسد

غالباً لوگ اتنے ہی سے مطمئن نہیں ہوتے تھے، ایک کاتب نے غالباً کسی کے بہکانے سے اس سے بھی زیادہ سخت چال چلی اور ان کا ایک شعر چپکے سے "تاریخ بدایونی" کے ایک نسخے میں جسے وہ نقل کر رہا تھا، ایک جگہ درج کر دیا، وہ شعر یہ تھا ؎

نے جائے در دوں رفتن و نے پائے بروں شد
در ماندہ ایں دائرہ ام ہمچو حلاجل

غنی کا یہ شعر پہلے ہی سے اطراف و جوانب کے علمی و ادبی حلقوں میں مشہور ہو چکا تھا، اب جو

[1] مآثر الکرام ج ۲ ص ۲۰۲

غنی کے مہربانوں میں سے ایک کی نظر تاریخ بدایونی میں مرقوم اس شعر پر پڑی تو اس نے غنیؔ کو متوجہ کرایا، غنیؔ یہ سنکر بیحد شرمندہ ہوئے، اور اس دن سے شعر کہنا ہی ترک کر دیا، اس کا اشارہ اس شعر میں ہے

ترک گویائی ز دخل نکتہ گیراں رستن است
بستن لب از سخن خوشتر ز مضموں بستن است

اس کے بعد ہر چند ان کے قدر دان دوستوں نے ان کو شعر کہنے پر آمادہ کرنا چاہا لیکن وہ یہ کہکر ٹال دیا کرتے تھے ؎

بر لب چوں آستیں زدہ ام بخیۂ سکوت
انگشت اگر زنی بلبم وا نمی شود

البتہ وہ اپنے تمام دوستوں کو جو ان کے اشعار لکھ لیا کرتے تھے، یہ ہدایت کرتے رہے کہ جہاں کہیں بھی شعر مذکور دیکھیں اسے مٹا دیں، اسی اثنا میں انھیں "تاریخ بدایونی" کا ایک قدیم نسخہ ہاتھ آگیا، انھوں نے بغور دیکھا اور اس شعر کو کہیں نہ پایا، پھر کاتب طلب کیا گیا، جس نے بیحد زجر و توبیخ کے بعد اپنے جرم کا اقرار کیا، تب کہیں جا کے غنیؔ کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا، اور انھوں نے شعر گوئی از سرِ نو شروع کی، یہ تمام حالات غنیؔ نے نثر میں خود لکھے ہیں، اصل عبارت دیوان جدید کے خاتمے پر درج کر دگئی ہے[1]۔

مداحین غنی لیکن سبھی ہم عصر یکساں نہیں تھے، چند ایسے بھی ہیں جن کا نام غنیؔ نے محبت و عزت کے ساتھ لیا ہے، کلیمؔ اور الٰہیؔ کی تاریخہائے وفات غنیؔ نے نظم کی ہیں، ان میں ان شعراء کی دل کھول کر تعریفیں کی ہیں، کلیمؔ کو نہ صرف 'بلبل باغ نعیم' بلکہ 'طور معنی کا کلیم' بھی قرار دیا[2] اور کہا ہے کہ اس کی وفات سے سخن یتیم ہو گیا، میر الٰہیؔ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ دنیا سے "گوئے سخن" ہی لے گیا اور اس کی محبت کا یہ اثر بتایا ہے کہ "لب گور در آید بہ سخن"، کلیمؔ ہی کے قطعۂ تاریخ میں قدسیؔ و سلیمؔ کا بھی ذکر کیا ہے لیکن یہ ذکر ضمنی ہے،

امیر الامراء اسلام خاں کی وفات پر بھی ایک تاریخی قطعہ نظم کیا ہے، اس میں غنیؔ نے اسلام خاں

[1] یہ عبارت نثر برٹش میوزیم و نسخہ ریسرچ میں تمام و کمال درج تھی، اسکے علاوہ نسخہ مصطفائی مطبوعہ میں بھی ہے،

کو قدردانِ امرا ہی نہیں بلکہ "آفتابِ اوجِ کمال" کے لقب سے یاد کیا ہے، اور "ہر آزادۂ دل گدا و شاہ" کو سوگوار بتایا ہے،

غنیؔ کے دیوان کے بعض نسخوں میں قلندر کی شان میں بھی ایک رباعی ملتی ہے ؎

از اہلِ سخن کس بقلندر نرسد	در شعر باو عرفیؔ و سنجر نرسد
ہر مصرع او بسکہ بلند افتادہ ست	ترسم کہ باو مصرع دیگر نرسد

اس سے بعض حضرات کو یہ خیال گزرا ہے کہ غنیؔ نے قلندر کے بارے میں غلو سے کام لیا ہے، لیکن جیسا کہ آخری دو مصرعوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رباعی ہجو ملیح ہے اور قلندر کی ہیجالا فانی کے جواب میں ہے، اس نکتہ کو صاحب "گلستان مسرت" نے پالیا تھا لیکن انھوں نے کسی شہادت و ثبوت کے بغیر یہ رباعی کسی قاسم نامی شاعر سے منسوب کر دی ہے،

غنیؔ کے دیوان میں ان کے ایک اور ہم عصر حسن بیگ رفیع قزوینی[1] کا بھی ذکر ملتا ہے لیکن صرف ایک شعر میں ؎

نگفتہ ایم غزل در زمینِ طرزِ رفیعؔ	کہ می شود سخنِ ما دریں طرح کم سبز

بعض تذکرہ نویسوں نے چند روایتیں ایسی بھی درج کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عنایت خاں آشنا اور ملا شاہ ماہر سے بھی راہ و رسم تھی، عنایت خاں آشنا، ظفر خاں احسن کا بیٹا تھا، اور مولانا غنیؔ اس کے یہاں آیا جایا کرتے تھے، لیکن ایک بار عنایت خاں نے یہ دعوی کیا کہ جو شعر ایک بار پڑھنے یا سننے سے سمجھ میں نہ آئے وہ بے معنی ہے، یہ سنکر غنیؔ نے کہا کہ عنایت خاں کی شعر فہمی پر مجھے جو آج تک اعتماد تھا وہ جاتا رہا، اس کے بعد وہ پھر آشنا کی صحبت میں کبھی نہیں گئے، "فانوس خیال" میں یہ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے:

[1] عالمگیر کے عہد میں کشمیر میں دیوان بیوتات مقرر ہوا تھا،

"گویند عنایت خاں آشنا دعوی کرد کہ شعر یکہ از یکمرتبہ خواندن یا شنیدن بفہم من در نیاید بے معنی ست، چون غنیؔ شنیدن ایں دعوی از وی نہ پسندید گفت تا حال اعتمادی بر شعر فہمی عنایت خاں داشتم امروز کہ آں اعتماد برخاست بعد ازاں ہیچگاہ باخان مذکور ملاقات نکرد"[1]

بعینہ یہی عبارت تذکرہ "مراۃ الخیال" مولفہ شیر علی خاں لودھی میں بھی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ "فانوس خیال" نے عنایت خاں آشنا لکھا ہے، اور مراۃ الخیال میں "عنایت خاں پسر ظفر خان ناظم صوبہ کشمیر"[2] محمد حسین آزاد نے "نگارستان فارس" میں بھی اس روایت کو نقل کیا ہے، مگر اس تشریح کے ساتھ "عنایت خاں ...... نے ایک دن اثنائے گفتگو میں کہا۔"

ملا شاہ کا ذکر یوں آتا ہے کہ ایک روز غنیؔ نے اپنا تازہ مطلع ان کے سامنے پڑھا کہ ؎

بے چراغیست اگر بزمِ خیالم غم نیست	مصرعِ ریختہ شمع ست کہ در عالم نیست

شاہ صاحب نے بنظر ایہام کہا کہ "ہاں کسی نے مصرع ریختہ کا ہے کو کہا ہوگا، چنانچہ مرزا سرخوش نے یہ روایت ان الفاظ میں لکھی ہے کہ

"روزے مطلع تازہ گفتہ پیش شاہ ماہر خواند ؎

بے چراغیست اگر بزمِ خیالم غم نیست	مصرعِ ریختہ شمع است کہ در عالم نیست

شاہ نظر بر ایہام و شوخی نمودہ گفت مصرع ریختہ کہ در عمر گفتہ باشد ہمیں خواہد بود"[3]

"نگارستان فارس" میں محمد حسین آزاد کو تسامح ہو گیا ہے، اور انھوں نے شاہ صاحب کا نام شاہ محمد علی ماہر لکھ دیا ہے، محمد علی ماہر جو برادرِ مرتب دیوان غنیؔ ہیں، ملا شاہ سے مختلف ہستی ہیں،

بعض تذکرہ نویسوں نے ظفر خاں احسن کی صحبتوں کا بھی ذکر کیا ہے، ایک روایت یہ ہے کہ

"ظفر خاں احسن ایں مصرع گفتہ نزد او (غنی) فرستاد، مصرع ظفر خاں

"ای لالہ دل بر ابر بہاراں چہ می نہی"

[1] فانوس خیال قلمی (علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری) ص ۴۳ [2] مراۃ الخیال مطبوعہ بمبئی ص ۱۶۲ [3] کلمات الشعرا از سرخوش

داد (غنی) بدیہہ مصرعہ رسانیدہ جاں بقالب مصر اعشق دمید (غنی) "داغے کہ بر دل است زشستن نمی رود"[1]

ایک اور روایت محمد امین داراب نقل کرتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ یہ روایت انھوں نے اپنے اساتذہ سے سنی ہے، وہ روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ ظفر خاں احسن ڈل جھیل کی سیر میں مصروف تھا کشتی میں اس کے ساتھ صائب اور دوسرے احباب کے علاوہ غنی بھی تھے، راستے میں ایک مشرب پر کوئی حسینہ مٹی سے ہاتھ دھو رہی تھی، یہ منظر دیکھ کر ظفر خاں احسن کی زبان پر بے اختیار یہ مصرعہ جاری ہوگیا، ع

تا بگل آلودہ سرپنجۂ چوں آفتاب

دوسرا مصرعہ لگانے کی فرمایش ہوئی، ابھی دوسرے خاموش ہی تھے کہ غنی بول اٹھے ع

آسماں زد نعرۂ یالیتنی کنت تراب

بہر حال شعر صرف سماعی ہے اور کسی تذکرہ میں مذکور نہیں ہے۔

ان ملاقاتوں کے باوجود اور ظفر خاں احسن کے سامنے بدیہہ گوئیوں کے ان مظاہروں کے باوجود یہ امر تعجب خیز ہے کہ احسن کا سا ادب دوست اور ہنر پرور غنی سے غافل رہا، شاید اس بے اعتنائی کا باعث غنی کی کمسنی رہی ہو، اور کچھ طرحی مشاعروں سے ان کی عدم رغبت، ظفر خاں احسن نے کشمیر میں طرحی مشاعروں کو بڑا رواج دیا تھا، لیکن غنی طرحوں میں کہنا پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے بھی اور کچھ استغنائے فطری کی وجہ سے وہ دربار ظفر خانی سے دور ہی دور رہے ہوں گے۔

بیماری | مولانا غنی کی صحت خراب رہتی تھی، اور وہ اکثر امراض و عوارض میں مبتلا رہتے تھے، ترک و تجرد اس پر مستزاد، ان اسباب نے مل جل کر انھیں پوست و استخواں کر دیا تھا، چنانچہ مسلم دیباچۂ دیوان غنی میں لکھتا ہے کہ:

"از پیکر ہمیو لاغریش پوستے و استخوانے ماندہ بودہ"[2]

---

[1] "شبستان بیخزان" از فضل علی خاں [2] دیوان غنی، مطبوعہ نولکشور ص ۵ طبع نہم

یہ درد مہلک تو نہ تھا لیکن زندگی بھر لاحق رہا اور اس کے باعث غنی زندگی ہی سے عاجز آگئے تھے، ایک رباعی میں کہا ہے:

دارم دردے کہ ہست جانکاہ مرا باشد لے کاش عمر کوتاہ مرا
ہر چند کہ نیست مہلک ایں درد ولے دایم تا مرگ ہست ہمراہ مرا

اس درد اعضا نے بالآخر اتنی شدت اختیار کر لی کہ وہ درس و تدریس کے کام کے بھی نہیں رہ گئے، ایک رباعی میں کہتے ہیں کہ

افتادم از درس ز درد اعضا کو شاگردی کہ مالد اعضائے مرا
می مالیدند تا مرا استاداں اے کاش کہ گوش میشدم سرتاپا

ایک اور قصیدہ نما نظم میں انھوں نے اپنے درد اعضا کا مشرح حال لکھا ہے، ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ "میں شدتِ درد سے زمین گیر ہوگیا ہوں اور بوریا پر پڑا رہتا ہوں اور پہلو بدلتا رہتا ہوں، اس کے علاوہ اور کوئی جنبش و حرکت ممکن نہیں ہے، علاج کی بہت فکر کی مگر کارگر نہ ہوا، ہر وقت اپنے ہی ہاتھ سے پاؤں دباتا رہتا ہوں، ساری عمر تیمم ہی کرتے بیت گئی، میری پیٹھ جھک گئی ہے، اور بیحد کمزور ہوگیا ہوں، چونکہ اہل عالم میں سے کوئی میرا بارِ درد اٹھا نہیں سکتا، اس لیے صرف خدا ہی پر تکیہ ہے، اور اب میں نے مصطفیٰ ؐ کی پناہ ڈھونڈھ لی ہے۔" ان میں سے چند اشعار بھی سن لیجیے

روز و شب از بس زمین گیرم ز درد دست و پا پیکر من می زند پہلو بہ نقشِ بوریا
گر چنیں از دردِ اعضا خشک گردد پیکرم می شود انگشت پایم رفتہ رفتہ خاریا
در علاجِ دردِ اعضا سخت حیراں ماندہ ام کاش میکردم ز حیرت یک نفس گم دست و پا
گشتن از پہلو بہ پہلوی دگر معراجِ ماست زدبانے بہر ما گردید نقشِ بوریا

بار درد من کسی از اہل عالم بر نداشت	عاقبت از ناتوانی تکیہ کردم بر خدا
در تیمم عمر من بگذشت چوں آئینہ ہا	ایں سزای آنکہ گشتم عمرہا در سر ہوا
پشت ما گردید خم از زود ضعف تن مرا	گرچہ محکم میشود چوں رشتہ میگردد دوتا
لشکر درد ار بتازد بر سر من باک نیست	میگریزیم لنگ لنگاں در پناہ مصطفیٰ
در پے مشکل کشایاں ہرزہ گردیدن چرا	کے گرہ وا میکند سوزن ز تار خویش وا

قصۂ دردت ندارد ہیچ پایانے غنی
تا بکے پیش طبیباں سر کنی ایں ماجرا[1]

اگرچہ درد پا کا ذکر غنی نے زیادہ کیا ہے، لیکن یہ درد تقریباً تمام اعضا میں رہا کرتا تھا، چنانچہ درد کے قافیہ میں ایک مختصر نظم میں لکھتے ہیں کہ

گاہے رود بجانب سر گاہ سوی پا	شد استخوان پہلوی ما نردبان درد

درد کے علاوہ کبھی کبھی تپ میں بھی مبتلا رہا کرتے تھے، اس سلسلے میں بھی دو رباعیوں سے کچھ روشنی پڑتی ہے۔

بر بستر ضعف روز و شب بیمارم	از گرمی تپ گداخت جسم زارم
جز نام نشاں نماند از پہلوی من	اکنوں گویا چو حرف پہلو دارم
خواہد دلم از سوز دروں گشت کباب	کی کم شود از سعی طبیب ایں تپ و تاب
از سوختن ایمن ننشیند ہر چند	در پائی چنار باغباں ریزد آب

اگرچہ بیماری کے باعث کسی کام کے قابل نہ رہ گئے تھے اور درس و تدریس سے بھی جو معاش کا واحد ذریعہ رہ گیا تھا، معذور ہو گئے تھے لیکن جیسا کہ ان اشعار سے خود معلوم ہوتا ہے

[1] "دیوان غنی" مطبوعہ و نیز نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔

شاعری کا مشغلہ اس عالم میں بھی جاری تھا،

وفات بالآخر موت ہی نے ان موذی امراض سے نجات دلائی، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخہ میں منجملہ اور عوارض کے "زخم زبان" کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس نسخہ میں غنی کے حسب ذیل شعر پر

من از زخم زبان دگراں دلریشم	در فغاں چوں قلم از زخم زبان خویشم

یہ عنوان بھی درج ہے کہ "وقت نزع برای زخم زبان خود گفتہ"۔ اگر یہ عبارت درج نہ ہوتی تو اس "زخم زبان" کو صرف استعارہ ہی سمجھا جاتا، آخری وقت میں صرف چند شعرائے کشمیر سرہانے موجود تھے، غنی اور ان شعراء کے مابین جو آخری گفتگو ہوئی اسے احمد علی خاں سندیلوی نے یوں بیان کیا ہے:-

"گویند در حالت نزع او شعرائے کشمیر بعیادت او رفتند، غنی گفت چراغی بودم کہ می باید خاموش شد شمارا بخدای سپاردم، شاعری گفت بگذار تا انگشت بچراغت تبرک کنم شاید بکار عبرت آید و نور حیات بیفزاید۔"[1]

بعض تذکرہ نویسوں نے غنی کی موت کا عجیب قصہ لکھا ہے کہ بادشاہ وقت نے حاکم کشمیر سیف خاں کو یہ حکم دیا کہ وہ غنی کو حاضر دربار کریں، غنی نے جانے سے گریز کیا اور کہا کہ لکھ دیجئے کہ دیوانہ ہو گیا ہے، سیف خاں نے کہا کہ میں عاقل کو دیوانہ کیسے لکھوں، یہ سنکر غنی نے گریباں چاک کیا اور دیوانہ وار دربار سے باہر نکل آئے، اور پھر تین دن کے اندر فوت ہو گئے، نصرآبادی کی اصل عبارت یہ ہے:-

"از صحیح القولے مسموع شد کہ بادشاہ والا جاہ ہندوستان بسیف خاں حاکم کشمیر نوشت کہ او را روانہ پایہ تخت نماید سیف خاں او را طلبیدہ تکلیف رفتن ہند نمود، او ابا نمودہ

[1] تذکرہ "مخزن الغرائب" (قلمی) از احمد علی خاں سندیلوی

گفت کہ عرض کنید کہ دیوانہ است، خان گفت عاقلے راچوں دیوانہ بگویم او فی الفور گریبان خود دراد ریدہ دیوانہ وار از خانہ شد بعد از سہ روز فوت شد[1]"

محمد حسین آزاد نے بھی "نگارستان فارس" میں اس روایت کو نقل کیا، لیکن انھوں نے یہ لکھا ہے کہ غنی کی موت اس واقعہ کے چار دن بعد ہوئی،[2] لیکن "مفتاح التواریخ" میں بھی تین ہی دن بعد کی روایت ہے۔[3] صاحب "ایران صغیر" نے بھی نصرآبادی کے "تذکرہ" کے حوالے سے یہ عبارت نقل کی ہے۔ دراصل ان سب بیانات کا سرچشمہ وہی 'نصرآبادی' کی روایت ہے، محمد حسین آزاد کو چار دن بعد لکھنے میں سہو ہوگیا ہے، پتہ نہیں چلتا کہ "نصرآبادی" کی روایت کا ماخذ کیا ہے، انھوں نے اتنا ہی لکھنا کافی سمجھا ہے کہ "ایک صحیح القول سے سنا گیا" لیکن یہ صحیح القول کون تھا، اور خود اس نے جس سے سنا تھا وہ کہاں تک قابل اعتبار تھا، ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

اکثر حضرات نے اس روایت کو صحیح باور کرنے میں تامل کیا ہے،[4] ان کا کہنا یہ ہے کہ سیف خاں عالمگیر کے زمانے میں حاکم کشمیر تھا، اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اورنگ زیب عالمگیر ہی نے غنی کو طلب کیا تھا، چونکہ یہ سبھی کو معلوم ہے کہ اورنگ زیب زاہد خشک تھا اور بقول علامہ شبلی اس کے زہد خشک نے تو شاعری کا چراغ ہی گل کر دیا تھا،[5] اسے شاعروں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، اور "ملک الشعراء" کا عہدہ بھی اسی کے دور میں تخفیف میں آگیا تھا لیکن ایسا نہیں ہے کہ اورنگ زیب کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی ہی نہ رہی ہو، سعدی، حافظ، نظامی، نظیری، صائب، ملا شاہ اور فانی کشمیری کے دواوین عالمگیر خاص طور سے اپنے مطالعہ میں رکھتا تھا،[6] اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کچھ اس کے محبوب شاعر بھی تھے، جن میں غنی کے استاد فانی اور ان کے ہم طرز صائب بھی شامل تھے، پھر غنی کی شاعری میں معنی آفرینی پر زیادہ زور تھا، اور شراب و شاہد کا ذکر کم ہی ملتا تھا، پھر خود غنی کے تورع وغیرہ کا ذکر

۱؎ تذکرہ نصرآبادی مطبوعہ طہران ۲؎ نگارستان فارس مطبوعہ کریمی پریس لاہور ص ۲۰۰ ۳؎ مفتاح التواریخ ص ... ۴؎ مولوی کرام الحق ... معارف نومبر ۱۹۳۲ء اور ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی آہنگ ستمبر ۱۹۵۵ء ۵؎ شعر العجم جلد سوم ۶؎ بزم تیموریہ مطبوعہ معارف پریس

سن کے اگر اورنگ زیب نے انھیں دلی بلوانا چاہا ہو تو یہ زیادہ بعید از قیاس بھی نہیں کہا جا سکتا۔

سال وفات: غنی کے حالات کے سلسلے میں جو امور بحث طلب اور مابہ النزاع ہیں وہ ان کا سال وفات بھی ہے، اور ضمناً وفات کے وقت غنی کی عمر بھی ہے، قدیم ترین تذکرہ جو غنی کے قریب العہد بھی ہو، سرخوش کا "کلمات الشعراء" تو ذکر وفات سے خالی ہے، اور دوسرا شاہد مسلم ہے، جس نے غنی کے دیوان کے دیباچہ میں اس پر روشنی ڈالی ہے، ان دونوں میں لیکن مسلم نے دیباچہ میں اس بات کو صراحۃً درج کتاب کیا ہے کہ جس سال غنی کی وفات ہوئی اسی سال مسلم نے دیوان غنی کی تدوین کی، اور اس سال کی وضاحت اس کے دو قطعات تاریخ سے ہو جاتی ہے۔ جو دیباچے میں درج ہیں، ایک مصرع فارسی میں ہے اور ایک عربی میں، دونوں ہی سے ۱۰۷۹ھ نکلتے ہیں، وہ دونوں مصرعے یوں ہیں:

تاریخ وفات از پے سند بگو	پنہاں شدہ گنج نہری زیر زمیں ۱۰۷۹ھ

ایضاً

دل زخمہ سال رحلتش چو طلب کرد	تا لنا ان تقول حی غنیا ۱۰۷۹ھ

یہ شہادت معاصرانہ ہے، اور اس کی مطابقت ایک اور ہم عصر شہادت سے ہوتی ہے، وہ ہے محمد علی ماہر کی تصنیف کردہ تاریخ وفات، محمد علی ماہر وہی بزرگ ہیں جنھوں نے بقول سرخوش و دیگر تذکرہ نویسان دیوان غنی کو مرتب کیا تھا، یہ غنی کے ہم عصر تھے، انھوں نے بھی قطعہ تاریخ کہا ہے، جسے شیر علی خاں لودھی اور طامس بیل دونوں نے ہی نقل کیا ہے،[1] فانوس خیال میں تو سال کی وضاحت بھی ہے:-

"در سال ہزار و ہفتاد و نہ وفات یافت۔ محمد علی ماہر تاریخ گفتہ:

چو داوش فیض صحبت پیشِ کمال محسن فانی	غنی سر حلقۂ اصحاب او در نکتہ دانی شد

۱؎ تذکرہ مرآۃ الخیال مصنفہ شیر علی خاں لودھی و مفتاح التواریخ مولفہ طامس بیل

تہی چوں کرد بزم شیخ را گر دید تاریخش | کہ آگاہی سوی دار بقا از دار فانی شد"[1]

چند دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی ۱۰۷۹ھ ہی لکھا ہے، مثلاً

۱- "و در سنہ تسع و سبعین و الف دامن از عالم سفلی برچید"[2]

۲- "در عین شباب فی ہکہزار و ہفتاد و نہ رو بآخرت آورد"[3]

۳- "و در ۱۰۷۹ھ دامن از عالم سفلی برچید"[4]

۴- "در اوائل عہد عالمگیری و شباب فی ۱۰۷۹ھ داعی حق را لبیک اجابت گفت"[5]

۵- "ومنہم الشیخ محمد طاہر المعروف بالغنی المتوفی سنۃ ۱۰۷۹"[6]

۶- "در ۱۰۷۹ھ تسع و سبعین و الف پا بدامن فنا کشید"[7]

۷- "تذکرۃ الشعرا، مولفہ مولانا محمد عبدالغنی خاں غنی فرخ آبادی نے بھی سنہ وفات ۱۰۷۹ھ ہی بتایا ہے" (ص ۹۶)

اس طرح ۱۰۷۹ھ میں غنی کی وفات کی روایت تواتر کو پہنچی ہوئی ہے، اور کسی کو گنجائش کلام نہیں ہو سکتی، لیکن ہمارے قدیم تذکرہ نگاروں کی ایک عام عادت تھی کہ وہ سنین کی صحت کی خاص پروا نہیں کرتے تھے۔ اس لیے بعض تذکروں میں اس کے برعکس اور خود باہم متضاد بیانات بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان میں قدیم تر مراۃ العالم ہے، اگرچہ یہ بھی دیباچہ مسلم سے قدیم تر نہیں ہو سکتی اور بختاور خاں کو غنی کے بارے میں مسلم سے زیادہ صحیح معلومات بھی نہیں ہو سکتیں، کیونکہ مسلم غنی کا شاگرد خاص تھا، بہرحال بختاور خاں نے لکھا ہے کہ

"در سنہ ہزار و ہفتاد و ہفت از خارستان دنیا دل برکندہ میل گلگشت آباد عقبیٰ نمود عزیزی تاریخ رحلتش بطریق تعمیہ گفتہ ع "افتاد برزمین سخن از رفتن غنی۔" "وای غنی" "غنی بودہ" ہم یافتہ اند۔"[8]

[1] قاموس خیال قلمی علی گڑھ یونیورسٹی ص ۳۰۳ [2] سرو آزاد مخطوطہ دار المصنفین [3] نشتر عشق قلمی بانکی پور [4] شمع انجمن ص ۲۰ [5] خلاصۃ الافکار تالیف ابوطالب تبریزی قلمی تہران [6] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۳۳۳ از عبدالحئی [7] تذکرہ تاریخ الافکار از مولانا محمد قدرت اللہ گوپاموی [8] مراۃ العالم، بختاور خاں

خود اسی عبارت سے ۱۰۷۷ھ کی روایت غلط ثابت ہو جاتی ہے، کیونکہ "وای غنی" اور "غنی بود" کے فقرات سے تو ۱۰۷۷ھ کے اعداد ضرور حاصل ہوتے ہیں لیکن تعمیہ والے شعر سے ۱۰۷۷ھ نہیں بلکہ ۱۰۸۰ھ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ "رفتن غنی" (۱۱۹۰) سے اگر سخن (۱۱۰) کے اعداد نکالے جائیں تو ۱۰۸۰ھ ہی ہوگا، اسکے علاوہ اس عزیز غنی کا نام بھی معلوم نہیں جس نے یہ تاریخ لکھی اور نہ تاریخ نگاری پر اس کی قدرت کے بارے میں ہمیں کوئی اطلاع بہم پہنچ سکی ہے، اسی کو بنیاد بنا کر مولف فرحۃ الناظرین نے بھی ۱۰۷۷ھ تاریخ وفات لکھ دی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ غنی کے کسی عزیز نے اس مصرع سے اس کی تاریخ وفات بطور تعمیہ نکالی ع افتاد برزمین سخن از رفتن غنی"۔ اور یہاں بھی بعینہ وہی تضاد واقع ہوا جو بختاور خاں کی تحریر میں تھا، اس کو اس دور کی ایک تالیف میں[1] بھی دہرایا گیا ہے، لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا گیا اس لیے قابل اعتبار نہیں،

تاریخ محمدی میں بھی غنی کا انتقال ۱۰۷۷ھ میں بتایا گیا ہے، لیکن اس نے اپنے بیان کی بنیاد مراۃ العالم کے علاوہ تذکرہ شیر خاں لودھی اور تذکرہ طاہر نصرآبادی پر رکھی ہے، شیر خاں لودھی کے تذکرہ مراۃ الخیال میں کہیں بھی ۱۰۷۷ھ درج نہیں ہے، بلکہ اس میں فانی کا قطعہ تاریخ درج ہے، جس سے ۱۰۷۹ھ نکلتے ہیں اور نصرآبادی نے نہ تو کوئی سنہ لکھا ہے اور نہ قطعہ تاریخ ہی درج کیا ہے، اس لیے تاریخ محمدی کی تصدیق تو خود اسی کے ماخذوں سے نہیں ہوتی، اس لیے ناقابل اعتنا ہے۔

ان سب سے مختلف تاریخ وفات "تاریخ حسن" میں درج کی گئی ہے، اس کی اصل عبارت یہ ہے:۔

"درسال ہزار و ہشتاد و دو در کمال ریعان جوانی بعد واقعہ شیخ محسن فانی ہشت ماہ بملک جاودانی انتقال نمود۔ تاریخ

از فوت غنی گشتہ گروہ غمگیں | ہر کس شدہ در ماتم او خانہ نشیں
تاریخ وفاتش ار بپرسند بگو | پنہاں شدہ گنج ہنری زیر زمیں[2]

[1] ایران صغیر [2] تاریخ حسن ج ۴ مطبوعہ ص ۲۱-۲۲

لیکن تاریخ حسن کی روایت اس لیے زیادہ قابل التفات نہیں ہے کہ یہ تاریخ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں تحریر ہوئی ہے، اور اسے شرف اولیت حاصل نہیں ہے۔ اس کی تالیف اور غنی کی وفات کے مابین تقریباً تین صدیاں حائل ہیں، اس کے علاوہ جو قطعۂ تاریخ اس میں درج کیا گیا ہے، اس سے وہی ۱۰۷۹ھ حاصل ہوتے ہیں، نہ کہ ۱۰۸۲ھ، جیسا کہ پیر حسن شاہ کا بیان ہے، اور یہ قطعۂ تاریخ مسلم شاگرد غنی کا ہے، اس لیے سب سے زیادہ باوثوق ہے۔ اگرچہ حاجی محی الدین سرای بلی نے "تاریخ کبیر" میں بھی ۱۰۸۲ھ لکھا ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ سرای بلی نے تاریخ کبیر میں صرف "تاریخ حسن" کا چربہ اتارا ہے، اور ان کی اپنی کوئی تحقیق نہیں ہے،

"تاریخ حسن" بھی دراصل "تاریخ اعظمی" کا چربہ ہے، چنانچہ تاریخ اعظمی کی عبارت دیکھئے:

"در کمال جوانی بعد واقعہ محسن فانی ہشت ماہ قضا کرد در سال ہزار و ہفتاد و نہ و این قطعہ در تاریخ وفاتش گفتند ؎

.... پنہاں شدہ گنج ہنری زیر زمیں

و بتعمیہ "بے سخن داد سخن دادہ غنی"[۱]

اسی تاریخ میں فانی کی وفات کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ؎

"چوں رحلت فرمود در ضمن بیرون خانہ خود در جوار سید در سال ہزار و ہشتاد و دو آسود"

ظاہر ہے کہ اگر فانی ۱۰۸۲ھ میں راہی ملک بقا ہوئے اور غنی نے ان کے بھی آٹھ مہینے کے بعد وفات پائی تو غنی کی وفات ۱۰۷۹ھ میں تو نہیں ہوسکتی، معلوم ہوتا ہے کہ اعظمی نے بالکل ہی تحقیق سے کام نہیں لیا ہے، تعمیہ والے مصرعہ "بے سخن داد سخن دادہ غنی" سے ۱۰۸۳ھ نکلتے ہیں، اگر انھوں نے ذرا بھی تحقیق کی ہوتی تو یہ ظاہر ہو جاتا کہ مسلم کے مصرعۂ تاریخ اور اس تعمیہ والے مصرعہ کی تاریخوں

۱؎ تاریخ کشمیر اعظمی (تاریخ واقعات کشمیر) مطبوعہ ص ۱۱۱

میں واضح تضاد ہے، اور پھر غنی نے اگر فانی کے آٹھ ماہ بعد وفات پائی اور تاریخ وفات فانی ۱۰۸۲ھ ہے تو وفات غنی بھی ۱۰۸۲-۸۳ھ میں ہوئی ہوگی جس کی تصدیق کسی بھی قدیم تذکرہ سے نہیں ہوتی، یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے کس بنا پر لکھ دیا ہے کہ غنی نے فانی کی وفات کے بعد انتقال کیا،

محمد علی ماہر کی ہم عصر شہادت اس کے خلاف ہے، ماہر نے قطعۂ تاریخ میں صاف کہا ہے:

تہی چوں کرد بزم شیخ را گردید تاریخش — کہ آگاہی سوی دار بقا از دار فانی شد

بزم شیخ (فانی) کے خالی کرنے سے یہ بالکل عیاں ہے کہ غنی کی وفات فانی کی حیات میں ہوئی،

اس کے علاوہ مولوی محمد حسین آزاد نے بھی لکھا ہے کہ:

"جس طرح شاعری میں استاد سے سبقت لے گیا تھا، مرنے میں بھی سبقت کی۔"[۱]

اس بیان کی تائید شیر علی خان لودھی نے بھی کی ہے:

"در سفر واپسیں نیز بر استاد سبقت گزید"[۲]

طامس ولیم بیل نے اس کو اور بھی صراحت اور تحقیق سے بیان کیا ہے جس کے بعد کسی شک شبہہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی، اس نے محسن فانی کے بارے میں لکھا ہے کہ

"رحلت شیخ در سنہ ہزار و ہشتاد و یک ہجری اتفاق افتاد"[۳]

اور غنی کشمیری کے بارے میں لکھا ہے کہ

"در عین جوانی دو سال قبل از وفات استاد در سنہ یکہزار و ہفتاد و نہ ہجری در کشمیر در گزشت"[۴]

اس طرح ۱۰۷۷ھ، ۱۰۸۰ھ اور ۱۰۸۳ھ وغیرہ کی روایتیں سب ناقابل اعتبار ہیں، اس لیے کہ کوئی بھی تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی، ان کے بیان کرنے والے بھی دو ایک ہیں اور ان کے بیانوں میں باہمی اور اندرونی تضاد موجود ہے، ۱۰۷۹ھ کی روایت سے قدیم اور غنی کے معاصرین کی ہے،

۱؎ نگارستان فارس ص ۱۸۲ ۲؎ تذکرہ مراۃ الخیال، از شیر خاں لودھی ۳؎ مفتاح التواریخ ص ۲۷۵ از طامس ولیم بیل
۴؎ ایضاً ص ۲۷۳

اور تذکرہ نگاروں اور مورخوں کی بہت بڑی اکثریت نے اسی کو صحیح باور کیا ہے، اس لیے اس کو تسلیم نہ
سمجھنا چاہیے۔

جوانامرگ؟ یہاں ایک ضمنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موت کے وقت غنیؔ کی عمر کیا تھی، بدقسمتی سے کسی نے
بھی غنی کی تاریخ ولادت درج نہیں کی ہے، لیکن کچھ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ غنیؔ کی وفات
عالم جوانی میں ہوئی، ان ہی میں شیر خاں لودھی بھی ہے، اس نے لکھا ہے کہ :۔

"اما مرغ، وحش در عین شباب بسر پنجہ و شاہین اجل گرفتار شد۔" (مراۃ الخیال)

بعض دوسرے تذکرہ نویسوں کا بھی یہی خیال ہے ؛

۱۔ " در عین جوانی .... در کشمیر در گذشت ۔" (مفتاح التواریخ)

۲۔ " او در عالم جوانی برحمت حق پیوستہ ۔" (تذکرہ مخزن الغرائب)

۳۔ " در عین شباب فی یکہزار و ہفتاد و نہ رو بآخرت آورد ۔" (نشتر عشق قلمی)

۴۔ "در اوائل عہد عالمگیری و شباب فی ۱۰۷۹ھ داعی حق را لبیک اجابت گفت ۔" (خلاصۃ الافکار قلمی)

۵۔ "در سال ہزار و ہشتاد و دو در کمال ریعان جوانی بعد واقعہ شیخ محسن فانی ہشت ماہ
بلکہ چار و دانی انتقال نمود ۔" (تاریخ حسن جلد چہارم)

لیکن ایک تو ان میں سے کوئی بھی روایت غنیؔ کے کسی ہم عصر اور شناسا نے نہیں کی ہے، اگر یہ واقعہ
ہوتا تو ضرور کوئی نہ کوئی لکھے ہوتا، بالخصوص مسلمؔ نے جو مقدمہ دیوان غنی لکھا ہے، اس میں اس کا ذکر ضرور ہوتا،
چونکہ غنیؔ کا انتقال ان کے استاد فانیؔ کی زندگی ہی میں ہو گیا، اس لیے لوگوں نے قیاس کر لیا کہ
ان کی موت جوانی ہی میں واقع ہوئی ہوگی، اور پھر ایک کے بعد دوسرا تذکرہ نویس اسی کو دہراتا رہا،
ایک نے شباب لکھا تو دوسرے نے "عین شباب" و "عین جوانی" کر دیا، تیسرے نے "اوائل شباب"
کا حاشیہ چڑھایا، اور چوتھے نے "کمال ریعان جوانی" لکھ کر حکایت پوری کی، اس طرح افسانہ بن گیا،

اگر صائبؔ وغیرہ کی صحبتوں اور ظفرؔ وغیرہ کے مشاعروں کی روایتیں صحیح ہیں تو غنیؔ کی شاعری کی عمر بھی تیس
برس سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتی، اگر یہ بھی فرض کیا جائے تو ابتدائی شاعری کے وقت ان کی عمر کوئی بیس برس
کے قریب تھی، تو پچاس ساٹھ سے کم عمر نہیں ہو سکتی، یہ صحیح ہے کہ پہلے لوگ پچاس کے سن تک کو جوانی
ہی میں شمار کرتے تھے، چالیس سال تک تو مزاج طفلی باقی رہتا تھا، پھر بھی "اوائل شباب" وغیرہ کا تصور
سراسر غلط ہے،

خود غنیؔ نے اپنے کئی اشعار میں اپنی پیری کا تذکرہ کیا ہے :۔

نیست عینک کہ نہادیم ز پیری بر چشم نگہ از شوق جمال تو زند سر بر سنگ

ز پیری ریخت دندانم ندادم من بیاد حق بباز ی آخر این تسبیح چون اطفال گم کردم

ز پیری چنان گشتہ ام ناتوان کہ دنداں بجنبند جائی زبان

افسوس کہ رفت نشہ عہد شباب سرخوش نشدیم یکدم از بادہ ناب

از بہر تماشای جہاں ہمچو حباب تا وا کردیم چشم رفتیم بخواب

بگذشت عمر و موی سفیدی بجا گذاشت خاکستری ز قافلہ یادگار ماند

موگشت سپید و ریخت دنداں در صبح شود ستارہ پنہاں

بسکہ مانند کماں بکجم از پیری کاست تا نہ گیرد کمرم کس نتواند برخاست

بچشم خود نتواں دید صبح پیری را خوشم کہ دیدہ ز موی بیشتر سفید شدست

بالوں کی سفیدی، دانتوں کے گرنے اور بصارت کے زائل ہو جانے سے یہ گمان گزر سکتا
ہے کہ غنی بے حد ضعیف ہو گئے تھے لیکن یہ دھیان میں رکھنا چاہیے کہ غنیؔ کی زندگی کا بیشتر حصہ بیماریوں
اور بالخصوص جانکاہ درد اعضا کی نذر ہوا، پھر انھوں نے ریاضت و ترک لذات میں بھی اپنے کو بہت
گھلایا اور کھال اور ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بنکر رہ گئے ۔ اسلیے ان اشعار میں ضعیفی کی جس شدت کا اظہار

ملتا ہے، اس کا سن سے تطابق کرتے وقت انکی عام صحت جسمانی اور ریاض روحانی کا خیال رکھنا ضروری ہے، اس سے بھی یقیناً یہی نتیجہ برآمد ہوگا کہ اگرچہ انکی موت جوانی میں نہیں ہوئی لیکن موت کے وقت انکی عمر پچاس سال سے متجاوز نہیں تھی۔

مدفن

انکے مدفن کے بارے میں بھی بیانات مختلف ہیں، کوئی کہتا ہے کہ وہ "مزار شعراء" میں دفن ہیں جو مدگجن میں واقع ہے، اور کسی کا بیان ہے کہ وہ شیخ محسن فانی کی خانقاہ کے باہر ان ہی کے جوار میں محو خواب ہیں مفتی محمد سعادت نے تاریخ اعظمی (مطبوعہ) کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ "در مقبرہ ملا محسن فانی آرمیدہ"۔ ڈاکٹر صوفی نے مقبرہ کی تصویر بھی اپنی کتاب میں شامل کی ہے، لیکن جگہ کا نام قطب الدین پورہ لکھا ہے[1]، جو عالی کدل میں واقع ہے، خواجہ محمد امین داراب نے اپنے چچا خواجہ سلام الدین درابو کی زبانی خواجہ حاجی مختار شاہ اشائی کی یہ روایت نقل کی ہے کہ موخر الذکر ایک بار فتح کدل سے عالی کدل جا رہے تھے، عالی کدل پار کرکے اندر ایک کوچے میں ایک مقبرے پر ٹھہرے اور فاتحہ خوانی کی، استفسار پر حاجی صاحب نے بتایا کہ یہ غنی کی قبر ہے، یہ روایت اہل خاندان کی ہے، پھر اسکی تصدیق رسالہ "مولانا غنی" (مطبوعہ کریمی پریس لاہور) مولفہ اکبر نجیب آبادی سے بھی ہوتی ہے، اس رسالہ کی عبارت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قبر ابھی چند برس پہلے تک موجود تھی، اور اس پر سنگ مزار بھی نصب تھا، عبارت یہ ہے:-

"غنی کی قبر محلہ راجوری کدل واقع عالی کدل احاطہ مرزا حضرت حسین ملا ذری میں ہے، سنگ مزار (جیسا کہ منشی غلام احمد صاحب مہجور نے سری نگر سے لکھا ہے) موجود ہے، نام پڑھا جاتا ہے، باقی عبارت نہیں پڑھی جاتی، خان بہادر پیرزادہ مولوی محمد حسین صاحب عارف ایم اے (زمانہ جج (؟) ہائی کورٹ جموں و کشمیر) کلیم و قدسی وغیرہ نامور شعرائے کشمیر کی قبروں کے دیکھنے کے بعد غنی کی قبر پر گئے تھے، جیسا کہ وہ خود آئینۂ کشمیر میں کہتے ہیں ؎

کلیم و قدسی و ثانی، غنی کی بھی زیارت کی

شکستہ حال زین العابدین کا مقبرہ دیکھا

(باقی)

[1] کشمیر جلد دوم ص ۴۶۳

ایک اور تہذیب جدید کی ضرورت

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(یہ مقالہ ۱۰ مئی ۱۹۶۶ء کو تھیالوجیکل سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جلسہ میں پڑھا گیا)

موجودہ تہذیب جدید کا تجزیہ

موجودہ جدید تہذیب کے اقانیم ثلثہ یہ ہیں:-

(۱) فکر و ضمیر کی حریت

(۲) مادی ذہنیت

(۳) ذوق حسن و جمال

یہ تینوں، رومی و یونانی تہذیب سے لیے گئے ہیں، اور اُس وقت لیے گئے ہیں جبکہ مذہب دنیا سے کنارہ کش ہوکر اپنی افادیت کھو چکا تھا۔

دراصل مسیحیت نے دنیوی حالات و معاملات کی طرف کوئی توجہ دی اور نہ اجتماعی و تمدنی مسائل سے اپنا تعلق قائم رکھا اور دنیا کو اس قدر حقیر و ذلیل کر دکھلایا کہ فطرت خود اس کے خلاف ردعمل پر مجبور ہوئی۔

اس صورت حال سے تینوں نے کافی فائدہ اٹھایا، اور کسی مزاحمت کے بغیر نہایت آزادی و بیباکی کے ساتھ ان کو برگ و بار لانے کا موقع ملا،

ابتدا میں زندگی آگے بڑھنے کی طرف زیادہ متوجہ تھی، اس بنا پر مزاحمت کی ضرورت نہ محسوس ہوئی لیکن بعد میں جب برگ و باری کی جولانیاں "قابو سے باہر ہوئیں اور خرمن انسانیت

جلنے لگا تو فلسفہ کے ذریعہ آگ بجھانے کی کوشش ہوئی، حالانکہ یہ آگ فلسفہ کی خشکی سے نہیں، ایمان و وجدان کی سیرابی سے بجھ سکتی تھی۔

"جولانیوں" کے بے قابو ہونے کے بعد آگ کے شعلے کسی ایک گوشہ میں محدود نہ رہ سکے، بلکہ عقائد وخیالات، افکار و احساسات، سیاسی و اقتصادی نظام، اجتماعی و عمرانی فلسفہ، عائلی و معاشرتی تنظیم، شخصی و انفرادی تشکیل، غرض زندگی کا ہر شعبہ اور شعبہ کا ہر گوشہ اس کی لپیٹ میں آگیا، فطرت کا مفہوم بدلا، زندگی کے نئے تصور نے جنم لیا، فلسفہ و تاریخ کی مادی تعبیر ہوئی، اور مذہب و اخلاق کی معاشی توجیہ ہوئی اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ

(۱) انسان نورانی الاصل کی جگہ حیوانی النسل قرار پایا۔ (نظریۂ ارتقاء (ڈارون)

(۲) فطرت کی لطافت جبلت کی کثافت سے بدل گئی، (نظریۂ جبلت (میکڈوگل)

(۳) عفت وعصمت کا آبگینہ جنسیت کی ہوسناکی سے پامال ہوا، (نظریۂ جنسیت (فرائڈ)

(۴) انسان کی روحانیت اشتراکیت کی مادیت سے پاش پاش ہوئی (نظریۂ اشتراکیت (کارل مارکس)

اور بالآخر تہذیب جدید نے انسان کو ایک ایسی "نوع" میں تبدیل کر دیا جس کے اغراض و مقاصد مبدأ و منتہا، سب قدیم تہذیب سے مختلف تھے،

اس کا شریف و صالح انسان وہ نہیں ہے جو اخلاقی جواہر و بلند کرداری سے آراستہ ہو بلکہ وہ ہے جو فتحیاب ہوکر بقاء و ارتقاء حاصل کرے خواہ اس کے اوصاف و اخلاق "درندے" جیسے ہوں،

اسی طرح رذیل و غیر صالح وہ ہے جو شکست کھاکر ناکام و نامراد رہے، اگرچہ وہ "فرشتہ" جیسے خصائل و عادات سے متصف ہو۔

یہ تبدیلی اور قلب ماہیت محض اس بنا پر ہوئی کہ مذہب دنیا سے کنارہ کش ہوگیا، اور انسانی مسائل کارخانوں، تجربہ گاہوں اور اعداد و شمار کے دفتروں میں حل ہونے لگے،

مادی ترقیات

جدید تہذیب نے اگرچہ انسان کی روحانی خصوصیات کو نہ باقی رہنے دیا، لیکن مادی ترقیات میں اس قدر محیر العقول کارنامے انجام دیے کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئیں، چنانچہ اس نے عالم فطرت کا مطالعہ کیا، کائنات کے سربستہ راز کھولے، سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا، ستاروں کی گذرگاہوں تک پہنچے، سمندر کی سطحوں کو پاٹا، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روندا، مختلف علم و فن ایجاد کیے، قوت و طاقت کے نئے سامان فراہم کیے، نشر و اشاعت کے نئے ذریعے اختیار کیے، صنعت و حرفت کی نئی راہیں نکالیں، تجارت و زراعت کی نئی تنظیم کی، جلب منفعت کی شاہراہیں کھولیں، دفع مضرت کی اسکیمیں بنائیں، ذرائع آمدنی میں اضافہ کیا، ضروریات زندگی کی نئی طرح ڈالی، اس طرح ایک نیا نظام معاشرت وجود میں آیا اور نئی زندگی نے جنم لیا،

روحانی تسکین کا سامان

اس نئی زندگی میں صرف مادی ضرورتوں کا بند و بست نہیں ہے، بلکہ روحانی تسکین کا سامان بھی ہے، مثلاً فنون لطیفہ کی عریاں نمائش، عیش میں مشغول حسن و جمال کی تصویریں، شراب کی لہریں، رقص و سرود کی محفلیں، موسیقی کے نئے نئے عنوانات، حسن و نمائش کے نئے نمونے اور ڈانس کے نئے طریقے، بوائے فرینڈ و گرل فرینڈ کا سسٹم، کال گرل، کمپنی گرل اور پارٹی گرل میں تبدیل شدہ لیڈیاں، بعض ایسے "ازم" جن کی رو سے جنسی خواہش کو دبانا و چھپانا گناہ ہے، اور جنسی تسکین کا فلسفہ کہ جس طرح انسان اپنی پیاس بجھانے میں آزاد اور خود مختار ہے کہ جس سے چاہے پانی کا گلاس حاصل کرے، اسی طرح جنسی پیاس بجھانے میں وہ آزاد ہے کہ جس سے اور جس طرح چاہے اپنی پیاس بجھاکر تسکین حاصل کرلے، اس میں کسی قسم کی رکاوٹ شخصی و پرسنل معاملہ میں مداخلت ہے، وغیرہ،

مغرب کی ترقی میں سلبی پہلو کا اثر انداز ہے

تہذیب جدید کے اس مجموعہ میں صرف ایجابی پہلو کو دخل نہیں ہے، بلکہ سلبی پہلو بھی اثر انداز ہے، مذہب کے خلاف چونکہ فطرت کا "رد عمل"

موجود تھا اس بنا پر تشکیل جدید کے معماروں نے دفاعی انداز اختیار کرنے میں زیادہ سہولت سمجھی اور زندگی کی گاڑی کو اسی "لائن" پر ڈال دیا،

بلاشبہ یہ "انداز" ذہنی وفکری قوتوں کو منظم کرکے کاروانِ حیات کو تیز سے تیز تر بنا دیتا ہے، لیکن "بریک" پر اس کو قابو نہیں حاصل ہوتا ہے، اس لیے اسٹیم (احساس وجذبات) کی طاقت زندگی کی گاڑی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے، اور انسان محض "تماشائی" بنکر رہ جاتا ہے،

ایک شبہ کا جواب ممکن ہے بعض حضرات کو شبہ ہو کہ مذکورہ وسائل واسباب روح کی روایت و لطافت کے خلاف انسان کی تسکین کا ذریعہ کیسے قرار پائے، اور ان سے کیونکر تسکین حاصل ہو سکتی ہے؟

لیکن روایت ولطافت کی جس بنیاد پر شبہ کی گنجایش نکلتی ہے، جدید تہذیب نے اس کی بنیاد ہی کو منہدم کر دیا ہے، اب انسان اصل کے لحاظ سے "نورانی" نہیں بلکہ "حیوانی" بن گیا ہے اور ترقی کا جو اصول جسم انسانی کے تمام اعضا میں کام کر رہا ہے، بعینہ وہی اصول ذہنی وعصبی نظام میں جاری ہے، یعنی جسم کی طرح انسان کی تمام تر ذہنی وفکری خصوصیات بھی حیوان سے بتدریج ارتقاء کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی ہیں، اور نفس، روح، عقل، شعور وغیرہ مادہ ہی کی ایک صورت اور اسی کی نشوو ارتقاء کا نتیجہ ہیں، باہر سے کسی اور "جوہر" یا روحانی مداخلت کی کارفرمائی نہیں ہے،

اس بنا پر روح کی گذشتہ روایت ولطافت کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا، جدید انسان کی جیسی روح تھی اس کی مناسبت سے تسکین کے لیے سامان فراہم کیے گئے ہیں،

تہذیب جدید کے پاس سب کچھ ہے غرض تہذیب جدید کے پاس مادی ضرورتوں اور روحانی تسکین کے لیے سب کچھ ہے، عورت، دولت، حکومت، تصورات، نظریات، ایجادات، اختراعات، علم وفن فلسفہ وسائنس، کار وہوائی جہاز، بنگلہ وفرنیچر، کلب پارک، شراب کباب، سینما، کیمرا، ٹیلی ویژن، ریڈیو، ٹرانسسٹر، ٹرانسمیٹر، ریفریجریٹر، ایرکنڈیشن جسن کی نمایش، جوانی کی امنگ، محبت کی فراوانی،

اور ہوس کی حکمرانی وغیرہ

نیز اس کے قدموں پر مہ انجم کی جبینیں جھکی ہوئی ہیں، اس کے عشرت خانوں میں پھولوں کی سیجیں بچھی ہوئی ہیں، اس کے قبضہ میں سرمستی کی جاگیریں ہیں، اس کے تصرف میں ہوس رانی کی قندیلیں ہیں، اس کے چہرہ پر غازۂ مے ناب ہے، اس کی آنکھ میں سرمۂ برق پاش ہے اور ان سب کے ساتھ "لوریاں" دینے کے لیے گرجا، پادری، انجیل مقدس اور اقانیم ثلثہ (ابن، اب، روح القدس) بھی موجود ہیں۔

مشرقی تہذیب کا حالِ زار ادھر مشرقی تہذیب جس کو بدقسمتی سے تمام تر "اسلامی" سمجھ لیا گیا ہے، اس میں غربت وافلاس ہے، فاقہ زدہ جھریاں پڑے چہرے ہیں، بے نور آنکھیں اور خشک ہونٹ ہیں، خالی دماغ اور بے حس دل ہیں، ویران بستیاں اور سنسان سڑکیں ہیں، جلے جنگل اور بنجر کھیت ہیں، غم خانے ہیں جن کو مٹی کا دیا میسر نہیں ہے، جھونپڑیاں ہیں جن کے چولھے ٹھنڈے پڑے ہیں، بے روزگاری کی حسرت ونامرادی ہے، باپ کی مجبوری اور اولاد کی سرکشی ہے، بیوائیں ہیں جن کے سینہ کو فاقہ کی "انی" برمائے ہوئے ہے، یتیم بچے ہیں جن کے آنسو خشک ہو چکے ہیں، دوشیزائیں ہیں جو یاس وحرمان کی تصویر بنی بیٹھی ہیں، معصوم کلیاں ہیں جو بن کھلے مرجھا رہی ہیں،

ذات پات اور رسم ورواج کی لعنتیں ہیں، مفت خوری وکام چوری کی عادتیں ہیں، ذاتی مفاد واغراض کی پرستش ہے، قسمت کا ماتم ہے، جوانوں ونوجوانوں تک میں مایوسی ہے،

نیز حکمراں ہیں جن کا عزازیل سے سمجھوتہ ہو چکا ہے، قائدین ہیں جن کا حکمرانوں سے معاہدہ ہو چکا ہے، امرا ہیں جن کی عیاشی کی داستانیں ضرب المثل ہیں، زمیندار ہیں جن کے شکنجے میں کاشتکار کراہ رہے ہیں، علما ہیں جن کے دماغ جواب دے چکے ہیں، صوفیا ہیں جن کے دل سرد ہو گئے ہیں، نئی جلوہ گاہوں کے مدہوش ہیں، جنھوں نے ہوش میں آنے سے انکار کر دیا ہے، مذہبی طبقہ ہے جس کی باہمی دست وگریبانی سے ملاء اعلیٰ میں پریشانی ہے، مذہب ہے جسمیں شرک ونفاق

کی آمیزش ہے، مذہب ہے جس میں دین و دنیا کی تقسیم ہے، اور ان سب کے ساتھ "رب العلمین" "رحمۃ للعالمین"، "ہدی للناس" اور "شفاء للناس" کے نام بھی موجود ہیں،

مشرق مغرب کی گود میں جا بیٹھا اس تہذیب کا حامل معاشرہ سسکیاں لے رہا اور دم توڑ رہا تھا، عرصہ کے بعد جب اس نے کروٹیں بدلنا اور ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا تو اس کے سامنے ایک طرف لٹی پٹی فرسودہ چیزیں اور یاس و حرمان کی تصویریں تھیں، دوسری طرف نشاط و امنگ سے معمور زندگیاں اور قوت و طاقت سے بھرپور "توانائیاں" تھیں،

بیمار تو تھا ہی جس میں نہ ضبط و تحمل کی طاقت تھی اور نہ مدافعت و مزاحمت کی صلاحیت، مشرق و مغرب کے اس تضاد کو برداشت نہ کرسکا اور تہذیب جدید کی گود میں جا بیٹھا،

بالغ نظر علماء نے روکا، صاحب دل صوفیہ نے دعا کی، دانشوروں نے سمجھایا، مفکروں نے زور لگایا، دیدہ وروں نے شور مچایا اور فلسفیوں نے ماتم کیا لیکن یہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو سکا بلکہ ان بزرگوں کی کوششیں ان لوگوں کو بھی زیادہ متاثر نہ کرسکیں جن کی آنکھیں ابھی نہیں کھلی ہیں، اور جن کی علیحدگی "عصمت بی بی از بے چادری" کے مصداق ہے.

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کہیں فطرت خود ہی "ردعمل" پر تو مجبور نہیں ہو رہی ہے؟ اور تنگی و فرسودگی تو اس بغاوت کا سبب نہیں بن رہی ہے؟

یہ صحیح ہے کہ بیماری جھنجھلاہٹ پیدا کرتی اور مشروب پینے سے انکار پر آمادہ کرتی ہے لیکن "ساقی" اپنی ذمہ داری سے کیسے سبکدوش ہو سکتا ہے، جبکہ پلانے میں اس نے بیمار کی حالت کا لحاظ کیا ہے اور نہ زمانہ کی رعایت سے نئے ساغر و مینا تیار کیے ہیں،

فطرت خود کاٹ چھانٹ کرتی ہو دراصل یہ عالم کون و فساد ہے، یہاں ہر بگاڑ کے ساتھ بناؤ اور ہر تخریب کے ساتھ تعمیر ہے، نظام عالم کے ہر گوشہ میں کاٹ چھانٹ ہوتی رہتی ہے اور وہ خوب سے خوب تر کی طرف بڑھتا رہتا ہے،

جہاں کوئی شے فٹ کر دی گئی، پھر وہ کمتر شے کے لیے جگہ نہ چھوڑے گی،

اسی طرح یہاں قوموں کا عروج و زوال اور تہذیبوں کا اتار چڑھاؤ ہمیشہ ہوتا رہا ہے لیکن آجتک نہ کوئی قوم اپنی سابقہ حالت پر واپس آئی ہے اور نہ کوئی تہذیب اپنی عمارتوں اور کھنڈروں کے ساتھ لوٹ سکی ہے،

قانون فطرت کی یہ کارفرمائی مشرق و مغرب میں مسلّم ہے. اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا خلاف ورزی کبھی نہیں ہوتی ہے.

اس بنا پر جس طرح مغرب نے اصول و مبادیات اپنی قدیم تہذیب سے اور دوسرے ضروری سامان مشرق سے لیکر تہذیب جدید کی عمارت تیار کی ہے اسی طرح مشرق کو اصول و مبادیات اپنی قدیم تہذیب اور دوسرے ضروری سامان مغرب سے لیکر ایک اور "تہذیب جدید" کی عمارت تیار کرنی چاہیے،

یہ کوئی انوکھی بات نہ ہوگی، بلکہ ہر نئی تہذیب قدیم و موجود تہذیب سے بیشمار چیزیں لیکر دوبارہ آب و تاب اور نئے نقش و نگار کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے.

مغرب کی قدیم تہذیب کے پاس چونکہ اصول و مبادی کم تھے اس لیے اس کے کاروانِ حیات کو دفاعی انداز اختیار کرنا پڑا اور اس کو "بریک" پر قابو نہ رہ سکا لیکن مشرق کی قدیم تہذیب اصول و مبادیات سے مالا مال ہے، جو "کاروان" کو ایجابی انداز عطا کرتے اور "بریک" کو بے قابو نہیں ہونے دیتے ہیں.

ایک اور تہذیب جدید کی ضرورت ایک اور تہذیب جدید کی ضرورت اس لیے ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے، ان میں سے کوئی بھی محض دوسرے کی نقل و تقلید سے اپنے مسائل حل نہیں کرسکتا، پھر کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جن میں کسی کی تخصیص نہیں ہے، ان کو حل کیے بغیر کوئی قوم نہ مطمئن

ہو سکتی ہے اور نہ بقاء کی ضمانت حاصل کر سکتی ہے، مثلاً (۱) زندگی کے اطمینان وسکون کا مسئلہ (۲) جذبات پر عقل کو غالب کرنے کا مسئلہ اور (۳) عورت کا مسئلہ۔

یہ تینوں اس قدر اہم ہیں کہ ان کے حل کے بغیر ہر جگہ اور ہمیشہ زندگی خود زندگی سے گریزاں رہی ہے اور تمدن خود تمدن کا دشمن ثابت ہوا ہے، ان ہی سے گریز وفرار کی بنا پر موجودہ تہذیب خود اپنے دام کا شکار ہو رہی ہے اور فطرت کا انتقال شروع ہو گیا ہے،

موجودہ تہذیب کے ساتھ انتقامی کارروائی

(۱) زندگی کو پرسکون بنانے کے لیے عقل وفلسفہ کی نگاہیں عرصہ ہوا بیکار ثابت ہو چکی ہیں، لیکن ایمان ووجدان کی شمع ابتک روشن ہے، جس کی جانب مغرب نے کوئی توجہ نہیں کی، جس کے نتائج حسب ذیل ہیں:

خودکشی کے جس قدر واقعات مغرب میں ہو رہے ہیں مشرق اپنی تمام مایوسیوں اور ناکامیوں کے باوجود اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

یہ تہذیب طبعی نیند سے محروم ہو گئی ہے، اور نیند لانے کے لیے تقریباً بچاسی فیصدی آبادی تک خواب آور گولیوں کے استعمال پر مجبور ہو رہی ہے،

یہ تہذیب فطری سکون سے محروم ہو گئی ہے اور عارضی سکون کے لیے نشہ آور گولیوں کا استعمال بکثرت ہونے لگا ہے۔

شراب پانی کی طرح عام ہو گئی ہے، بچے، بوڑھے، جوان سب اس مصیبت میں مبتلا ہیں، اور اب تو ایل، ایس، ڈی (نشہ) کی مقبولیت روز افزوں ہے، جس کے استعمال سے انسان اتنا مدہوش ہو جاتا ہے کہ اس کی تمام دبی ہوئی خواہشات قول وفعل کے ذریعہ ظاہر ہونے لگتی ہیں۔

اس تہذیب نے باہمی الفت ومحبت کے احساسات لطیف بالکل ختم کر دیے ہیں، اور آج ہر انسان اپنے کو تنہا محسوس کرتا ہے۔

ان واقعات وحالات سے ظاہر ہے کہ موجودہ تہذیب اپنی تمام رعنائیوں اور دلکشیوں کے باوجود اخلاقی انحطاط کے کس درجہ پر پہنچ گئی ہے اور کس قدر غم آفریں بن گئی ہے، روح کی بےچینی اور ضمیر کی بیقراری اتنی بڑھ گئی ہے کہ انسان کو کسی کروٹ چین نصیب نہیں ہے، اور کوئی ایسا رشتہ باقی نہیں رہ گیا ہے جس کے ذریعہ جسم و روح میں ربط وتعلق قائم رہ سکے۔

جنسی بھوک کی تیزی اور تسکین سے بے بسی

(۲) کوئی ایسی مشین ابتک ایجاد نہ ہو سکی جو عقل کو جذبات پر غالب رکھ سکے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب نے شکم کی بھوک پر تو قابو حاصل کر لیا ہے لیکن جنسی بھوک میں سارے امتیازات ختم کر دیے ہیں، پھر بھی تسکین کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، عورت کو مختلف "ازموں" اور "فلسفوں" کے ذریعہ ہوس رانی کے لیے طرح طرح سے استعمال کیا جا رہا ہے، استلذاذ بالمثل کے لیے دسمبر ۱۹۶۵ء میں لندن کے دارالعوام سے جواز کا فتوی لیا جا چکا ہے، اس کے بعد دیکھیے جنسی تسکین کے لیے کونسی صورت اختیار کیجاتی ہے،

اس تہذیب نے عورت کے کس بل نکال لیے ہیں

(۳) عورت کا مسئلہ نازک سے نازک تر بنتا جا رہا ہے، اور مغرب کا دماغ اس کو حل کرنے میں ناکام ہو چکا ہے،

عورت ایک جوہری اور مستقل مخلوق ہے، جس کی کارگذاریوں اور قربانیوں سے انسانیت کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی، اس کے بغیر جنت بھی آدم کے لیے ویران تھی، اس میں حوا ہی سے جان پڑی تھی، اگر عورت نہ ہو تو دنیا بے آب ورنگ ہو کر رہ جائے،

اسی کی بدولت آدمؑ نے "ٹریننگ کورس" کی تکمیل کی اور اسی کی معصومانہ لغزش دنیا کی آبادی کا سبب بنی، اسی نے اپنی زندگی دے کر زندگی کے "راز" سکھائے، اسی کی گود نے علم وہنر کے چشمے بہائے، اور اسی کی مسرت نے خار میں پھول کھلائے

تہذیب جدید کے لیے بھی اس کی کارگذاریاں وقربانیاں کچھ کم نہیں ہیں، لیکن اس نے اس کا

نسوانی وقار کھو کر محض بزم عشرت کا کھلونا بنا دیا، اور اس غریب کو اس قابل نہ رکھا کہ وہ اپنے نسوانی شرف سے انسانی عزت و شرف کی حفاظت کر سکے۔ اس کے شیشۂ دل کو اپنی "مشین" کا پرزہ بنایا، اسکے آبگینۂ عصمت کو فولاد کی "سان" پر چڑھایا، اس کے معصوم حسن کو نمائش کے بازار میں فروخت کیا، اور جب ان سب میں وہ بے زبان نکلی تو مرغیوں کی طرح اس کو انڈا سینے پر لگایا، چنانچہ اسی اپریل ۱۹۶۶ء میں نیویارک کے مشہور تاجر مرے زیر ٹیس (Maury Zaretis) نے اشتہار دیا ہے کہ

"ایک ایسی ماڈل ٹائپ گرل کی ضرورت ہے جو مرغی کے انڈوں پر بیٹھکر مرغی کی طرح ان کو سینے کا کام دے سکے، ایسی نوجوان خاتون کو روزانہ سو ڈالر (پانچ سو روپیہ) اجرت دیجائے گی اور کام کے ختم پر ایک ہزار ڈالر بطور انعام ملے گا۔"

ایسی جلیل القدر خدمت کے لیے بھی "ماڈل گرل" نے اپنی وفاداری اور خود سپردگی پر آنچ نہ آنے دی اور سات سو سے زائد درخواستیں بھیجکر اپنی عالی ظرفی و فراخ حوصلگی کا ثبوت پیش کر دیا،

ماڈل گرل آفت پرکالہ میں تبدیل ہو چکی ہے

غرض موجودہ تہذیب نے عورت کی اصل حیثیت بالکل ختم کر دی ہے اور اب وہ بھی اس سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے جس میں اس کو موجودہ تہذیب نے بہا دیا ہے، چنانچہ ہر طریقہ کے مانع حمل آلات کے استعمال کے باوجود امریکہ میں ۱۹۶۵ء کے سروے کے مطابق ہر سال دس لاکھ اسقاط ہوتے ہیں، اس سے چھوٹے ملک "اٹلی" میں بھی یہی تناسب ہے اور ہر سال چالیس ہزار عورتیں اسقاط کے صدمہ سے مرجاتی ہیں،

"ڈنمارک" کی شرح پیدائش پچھتر ہزار (۷۵) فی سال ہے، لیکن ہر سال پندرہ ہزار (۱۵) سے پچیس ہزار (۲۵) تک اسقاط ہوتے ہیں، جن میں قانون کے مطابق صرف دو ہزار آپریشن ہوتے ہیں،

"پیرس" اور "ہیمبرگ" شہروں میں اسقاط کی تعداد پیدائش سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے، اسی طرح بن باپ کے بچوں کی پیدائش میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، انگلستان اور

"ویلز" میں منع حمل کی تمام تدبیروں اور اسقاطوں کے باوجود پچاس فی صد کنواری ماؤں کا اضافہ حال میں ہوا ہے،

عورتوں اور مردوں کے مشترک عریاں کلب قائم ہو جانے کے بعد عورت کی حیثیت چائے کے کپ اور سگریٹ کے پاکٹ سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے، اور یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں رجعت قہقری کر کے اپنی اصل بوزنیت پر نہ آجائیں، ان حالات میں توقع ہو سکتی ہے کہ مغربی تہذیب کی شکستہ کشتی اس بھنور سے نکل سکے گی،

موجودہ تہذیب کی بےبسی پر پاپائے روم کی خاموش شہادت

اس کا حل خود یورپ کے پاس بھی نہیں ہے، چنانچہ ابھی حال ہی میں ان حالات سے تنگ آکر پاپائے روم نے ایک کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے عصمت فروشی کی روک تھام پر زور دیا، لیکن جب ان سے سوال کیا گیا کہ اگر کسی ملک (جرمنی وغیرہ) میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو تو عصمت فروشی کا انسداد کس طرح کیا جائے، اس پر وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دے سکے،

پاپائے روم جس مذہب کے نمایندہ ہیں، اس کے پاس اس صورت حال کا کوئی حل نہیں ہے، اور جو حل ہے اس کا اعتراف کرنے سے صدیوں کی بنائی ہوئی عمارت مسمار ہوتی ہے، اس بنا پر خاموشی کے سوا ان کے لیے چارۂ کار کیا تھا،

یہ تہذیب صرف زندگی کے دن پورے کر رہی ہے

اس تہذیب کا دوسرا ہلاکت خیز پہلو اسلحہ کی دوڑ ہے، چنانچہ امریکی وزیر دفاع نے اعلان کیا ہے:-

"روس کے شہری علاقوں پر راکٹ برسانے سے اڑتالیس گھنٹہ کے اندر دس کروڑ روسی ہلاک ہو جائیں گے، ملک کی اسّی فیصد صنعتی استعداد تباہ ہو جائے گی، اور ایٹمی تابکاری سے واقع ہونے والی اموات اس کے علاوہ ہوں گی۔"

اسی کے جواب میں روس کے وزیر دفاع نے خم ٹھونک کر اس کا یہ جواب دیا ہے کہ:

"روس نے ایسا خوفناک "میزائیل" تیار کر لیا ہے جو خلا سے دنیا کے کسی حصہ پر ایٹم
گرا کر اسے تباہ کر سکتا ہے، جس کا امریکہ کے پاس کوئی دفاع نہیں ہے"

یہ ۱۹۶۵ء کے ہیں جس میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، اور چین کے حالیہ ایٹمی
تجربہ نے تو ہر طرف ایک تہلکہ مچا رکھا ہے۔

اسلحہ کی اس دوڑ کے بعد تہذیب جدید آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھ گئی ہے، اگر اب بھی
اس تہذیب کے حاملوں کا اخلاقی احساس بیدار نہ ہوا تو دنیا ان کے ہاتھوں جہنم بن جائیگی
اور اس تہذیب کی لگائی ہوئی آگ خود اس کو خاکستر کر کے رکھ دے گی،

ایک اور جدید تہذیب کی بنیاد ہیں

لیکن ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔ ان حالات کی اصلاح کے لیے
ایک جدید تہذیب کی تشکیل کی ضرورت ہے، جس میں

(۱) انسان کی نورانی اصل کو ابھارا جائے۔

(۲) مادیت و روحانیت کا آمیزہ تیار کیا جائے،

(۳) ایمان و وجدان کے ذریعہ زندگی کو پرسکون بنایا جائے،

(۴) موثر اعمال اور تدبیروں کے ذریعہ جذبات پر عقل کو غالب رکھا جائے،

(۵) عورت کی قدر و منزلت اور صنفی خصوصیت کو ملحوظ رکھ کر اس کے اعمال و فرائض
متعین کیے جائیں۔

تشکیل کے لیے تین قسم کی توانائیاں درکار ہیں

اس جدید تہذیب کی تشکیل کے لیے تین قسم کی توانائیاں درکار ہیں:
(۱) سیاسی توانائی، (۲) علمی توانائی اور (۳) مذہبی توانائی

مغرب نے ان ہی تینوں کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ اور ان ہی کے زوال نے مشرق کو اس کی

اندھی تقلید پر مجبور کیا ہے،

پہلی دو باتوں کے سلسلہ میں ہمارے بزرگوں کی مساعی بڑی حد تک کامیاب ہو چکی ہیں،
یعنی سیاسی اداروں میں جان پڑ گئی ہے، اور علم و ہنر میں پیش رفت ہو چکی ہے،
لیکن مذہبی توانائی کا کام ہنوز باقی ہے، اس کے لیے دو باتوں کی شدید ضرورت ہے۔

(۱) مذہب کو زندگی میں جاری و ساری بنایا جائے،

(۲) مذہب کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو
اور اس کی تعلیمات فطرت و کائنات کے سربستہ رازوں کی تحقیقات میں مددگار ہوں،

جہانتک پہلی بات کا تعلق ہے، اس کے لیے مختلف جماعتیں اپنے اپنے انداز سے کام کر رہی
ہیں اور خوشی ہے کہ ان کے ذریعہ مذہب کی تخم ریزی ہو رہی ہے، اور اس کی روایات سے تعلق
قائم ہو رہا ہے، لیکن مجموعی اثرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تھکی ماندی قوتیں اور کام سے جی چرانے
والی طبیعتیں ہیں کہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے پناہ لینے کیلئے بیٹھ گئی ہیں اور آگے بڑھنے سے گھبرا رہی ہیں،

دوسری بات کے لیے کچھ نئی طاقتیں ابھر رہی ہیں جن سے بجا طور پر توقعات وابستہ کیجا سکتی ہیں، لیکن انکی
اکثریت ہوس کی نیرنگیوں اور عقل کی چیرہ دستیوں سے اسقدر مرعوب ہو کر اس میں مذہب کی دلیرانہ نمایندگی کی
سکت نہیں اور مشرق میں رہنمائی کی جرأت نہیں ہے،

ایسی حالت میں مذہبی توانائی کا کام کسقدر اہم ہے اور اسکے بغیر تہذیب جدید کی تشکیل کیونکر ہو سکتی ہے،
وقت کا یہی وہ کام ہے جسکی سب سے زیادہ ضرورت ہے، جو شخص حالات و تقاضوں کو ملحوظ رکھکر رضائے الٰہی
کے لیے اس کام کو انجام دیگا، موجودہ دور میں تجدید احیائے دین کا سہرا اسی کے سر بندھے گا،

تشکیل کیلئے یہ وقت سب سے بہتر ہے

نئی تہذیب کی تشکیل کے لیے اس سے اچھا وقت غالباً پھر کبھی نہ آئیگا کیونکہ
مادیت کے سیلاب نے خود مغرب کے مفکرین کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے اور مشرق کی وہ اخلاقی و روحانی روایات موجود ہیں،

جنھوں نے ایک زمانہ میں مغرب کی رہنمائی کی تھی، دوسری طرف موجودہ دور کی وہ اختراعات موجود ہیں جن سے تہذیب جدید کی عمارت بنی ہے، وہ پیمانہ بھی موجود ہے جس کے ذریعہ خیر و شر کی حد بندی ہوتی ہے، ان کے صالح اجزاء کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب جنم لے سکتی ہے۔

دیکھنا صرف یہ ہے کہ موجودہ اشیاء میں سے کس کو لینا اور کس کو چھوڑ دینا ہے، کس میں کاٹ چھانٹ کرنا اور کس سے نظر بچا کر نکل جانا ہے، کس کو بعینہ "فٹ" کرنا اور کس کو بالکلیہ نظر انداز کر دینا ہے، کس میں نئی روح ڈالنی ہے اور کس کے لیے نیا قالب تیار کرنا ہے، عبوری مرحلہ کس طرح گذارنا اور ہنگامی حالات کا کیسے مقابلہ کرنا ہے اور سب سے بڑی بات فطرت کی کاٹ چھانٹ کو سمجھنا اور اس سے عبرت حاصل کرنا ہے کہ چالیس سال کے عرصہ میں نہ معلوم کتنے "کافروں" کو بجبر وہ "مسلمان کر چکی ہے۔

چونکہ مغرب نے اپنی جلوہ آرائیوں سے مشرق کی نگاہ اور دل دونوں کو فریب خوردہ بنا دیا ہے، اس بناء پر حزم و احتیاط کے باوجود اس کام میں شدید مخالفت ہوگی اور مختلف زاویۂ نگاہ کا مقابلہ کرنا پڑیگا، ایک طبقہ تردامنی کا دوسرا چاک گریبانی کا طعنہ دیگا، کسی کو "جدید" سے گھبراہٹ ہوگی، کوئی "تشکیل" سے برافروختہ ہوگا، اپنوں کی ناراضی اور بیگانوں کی شماتت کا مقابلہ کرنا پڑے گا، لیکن یہ کوئی بات نہ ہوگی، تعمیر و اصلاح کی راہ میں ہمیشہ سے یہ ہوتا چلا آیا ہے، اس لیے "لومۃ لائم" کی پروا کیے بغیر بس اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اور خود کو مسئول مان کر "تشکیل" کے فرائض انجام دیتے رہنا چاہیے۔

"ابتک اس سلسلہ میں کوئی ٹھوس جامع کوشش نہیں کیجا سکی ہے، اور یہ کوشش بھی "جادو" کی چھڑی نہ ثابت ہوگی کہ اسکو چھوتے ہی سارے کام بنجائیں، بلکہ اس میں کامیابی کیلیے ایک عرصہ درکار ہوگا، البتہ اس کوشش سے فوری اور بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ یہ کوشش "ریکارڈ" میں آجائیگی، اور خود فطرت حسب عادت اس سے استفادہ پر مجبور ہوتی رہے گی، اور ایک دن دنیا یہ بھی دیکھ لے گی کہ مشرق مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو جائیگا، اور نئے نقش و نگار اور نئی آب و تاب کے ساتھ دنیا کے افق پر نمودار ہوگا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز

الہ آباد (۲)

از جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکھنؤ یونیورسٹی

(۲)

انیسویں صدی میں بھی الہ آباد میں چند ممتاز علماء گزرے ہیں، حافظ رحمت اللہ (متوفی ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء) اگرچہ پنجاب کے رہنے والے تھے، لیکن الہ آباد میں انھوں نے سکونت اختیار کر لی تھی، اوائل عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے، لیکن ان کی یادداشت اسقدر تیز تھی کہ کہا جاتا ہے کہ جس عبارت کو وہ تین مرتبہ سن لیتے تھے اسے وہ لفظ بہ لفظ دہرا سکتے تھے، اور عربی کی لغت قاموس کو انھوں نے صرف چھ مہینہ میں حفظ کر لیا تھا، علم حدیث میں صحاح ستہ بھی ان کے نوک زبان تھی،[1]

اسی عہد کے ایک اور عالم مفتی محمد اسد اللہ الہ آبادی ہیں، جو مولانا فضل رسول بدایونی کے شاگرد تھے، اور کچھ عرصہ تک فتحپور میں مفتی عدالت رہنے کے بعد آگرہ میں قاضی القضاۃ ہو گئے تھے، اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں وہ جونپور کے صدر الصدور کے عہدہ پر فائز رہے اور وہاں ہی ۱۳۰۰ھ (مطابق ۱۸۸۲ء) میں ان کا انتقال ہوا،[2] انکی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، مولوی فخر الدین جو شاہ رفیع الزماں الہ آبادی کے اخلاف میں تھے وہ بھی اس دور کے الہ آباد کے جید علماء میں شمار ہوتے ہیں، علوم منقول و معقول انھوں نے علماے فرنگی محل سے اکتساب کیے،

---

[1] تذکرہ علماے ہند، ص ۶۲ [2] ایضاً ص ۲۲

اور اس کے بعد الہ آباد واپس آکر وہ اپنے خاندانی سجادہ پر ایک مرشد کی حیثیت سے رونق افروز ہوئے، درس و تدریس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے فن طب میں بھی اس حد تک دستگاہ حاصل کی کہ حکیم بادشاہ کے لقب سے مشہور رہوئے، ۱۳۰۳ھ (مطابق ۱۸۸۵ء) میں بہتر سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا، ان کی تصانیف میں رسالہ بشیر و نذیر، رسالہ مناسک حج، رسالہ ازالۃ الشکوک[1] الادوام کافی مشہور ہیں، [1] سید علی کبیر بن شاہ علی جعفر جو عموماً شاہ محمد میر نجان کے نام سے مشہور ہیں، ۲۸ محرم ۱۲۱۳ھ (مطابق ۹۷-۱۷۹۶ء) میں الہ آباد میں پیدا ہوئے، ان کے جد امجد ابراہیم شرقی کے عہد میں جونپور آئے تھے، اور وہاں سے نسلاً بعد نسل غازیپور اور وہاں سے الہ آباد منتقل ہوئے، شاہ میر نجان رضی الدین احمد الہ آبادی کے شاگرد تھے، اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں تحفۃ الکبیر، غرۃ الجمال، غایۃ المطالب اظہار السعادۃ فی ترجمہ اسرار الشہادۃ (جو شاہ عبد العزیز دہلوی سے منسوب سر الشہادتین کا فارسی ترجمہ ہے) کافی مشہور ہیں، ان کے علاوہ انھوں نے ایک فارسی تذکرہ بھی مرتب کیا جس کے سال افتتاح (۱۲۴۳ھ) کے مطابق اس کا نام انھوں نے خازن الشعراء اور سال اختتام (۱۲۴۸ھ) کے مطابق واقعات النادرات رکھا ہے، اس تذکرہ میں انھوں نے ایک سو نوے (۱۹۰) شاعروں اور اپنے جد شاہ خوب اللہ اور ان کے چچا شیخ محمد افضل کے مریدوں، شاگردوں اور عزیزوں کے حالات بیان کیے ہیں، صاحب تذکرۂ روز روشن نے ان کے ایک اور تذکرہ دبستان شعراء کا بھی ذکر کیا ہے، [2] نثر کی ان تصانیف کے علاوہ وہ ایک دیوان اور چند مثنویوں کے بھی مصنف ہیں، اس عہد کے دوسرے فارسی مصنفین میں منشی نند رام اور علی اکبر الہ آبادی بھی قابل ذکر ہیں، اول الذکر نے علم ریاضی پر ایک کتاب سیاق نامہ ۱۸۷۹ء میں تصنیف کی [3] اور موخر الذکر فصول اکبری اور اصول اکبری کے مصنف ہیں، [4]

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۱ [2] Persian Literature - A bio-bibliographical Survey, P. 1264 (R) و تذکرہ روز روشن صفحہ ۳۱۰

[3] فہرست مطبوعات فارسی در رضا لائبریری رامپور [4] قاموس المشاہیر ج ۲ ص ۹۳

مذکورہ بالا علماء اور فارسی و عربی نثر نگاروں کے علاوہ الہ آباد سے تعلق رکھنے والے فارسی شعراء کی تعداد بھی بہت کافی ہے، ان شعراء میں ابو البرکات ملا منیر لاہوری کا نام سر فہرست ہے، وہ عہد شاہجہانی میں سیف خاں ناظم الہ آباد کے ساتھ عرصہ تک الہ آباد میں مقیم رہے، ان کا انتقال ۱۰۵۴ھ (مطابق ۱۶۴۴ء) میں اکبر آباد میں ہوا، منشآت ملا منیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک لاکھ سے زیادہ فارسی اشعار کہے تھے، ان کے علاوہ ملا منیر کو قصائد عرفی کے پہلے شارح ہونے کا فخر بھی حاصل ہے، [1] ان کے اشعار کا نمونہ درج ذیل ہے،

کس ایمنی از آفت ہمسایہ ندارد   ہر شعلہ کہ برخواست ز دل بر جگر افتاد
قدم بروں نہ نہد ماہ من ز منزل خویش   بود چو صورت آئینہ زیب محفل خویش

عہد شاہجہانی کے ایک دوسرے شاعر جن کا الہ آباد سے تعلق ہے شیخ محمد محسن فانی ہیں، وہ صوبہ الہ آباد کی صدارت پر فائز تھے، لیکن ۱۶۴۶ء میں فتح بلخ کے موقع پر ان کے دیوان کا ایک نسخہ جس میں حاکم بلخ کی مدح میں بھی ایک قصیدہ تھا، شاہجہاں کے ہاتھوں میں پڑا، جو اس کی ناگواری کا باعث ہوا، چنانچہ اس نے فانی کو صدارت کے عہدہ سے برطرف کر دیا اور انھوں نے اپنی بقیہ عمر کشمیر میں گزاری، جہاں ۱۰۸۱ھ (مطابق ۱۶۷۰ء) میں ان کا انتقال ہوا، [2] شیخ محمد افضل (متوفی ۱۱۲۱ھ) کا ذکر پہلے نثر نگاروں کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے، بندرابن خوشگو نے انھیں شعراء میں بھی شمار کیا ہے، [3] ان کا تخلص محقر تھا، حسب ذیل اشعار ان کے کلام کا نمونہ ہیں:-

ز من قامت آں صنم دیدہ ام   قیامت بیک حرف کم دیدہ ام
دل بیادش محو گشت و نام می گیرد ہنوز   مست من از دست رفت و جام می گیرد ہنوز

محقر کے بیٹے شیخ کمال الدین حقیر بھی بقول خوشگو عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے،

---

[1] شمع انجمن، ص ۴۴۴ [2] قاموس المشاہیر، ج ۲ ص ۱۰۸ [3] سفینۂ خوشگو، ص ۳۵

ان کے کلام کا کچھ اندازہ حسب ذیل اشعار سے ہو سکتا ہے[۱]،

از عدم تا بہ عدم خوش سفرے درپیش است　　لیک در منزل ہستی خطرے درپیش است

ہست ز آفات نگہبان خلائق محفوظ　　خانہ را حفظ کند قفل و نگہبان خود است

اٹھارہویں صدی میں الہ آباد کے سب سے نامور شاعر میر محمد افضل ثابت ہیں، بقول احمد علی ہاشمی ان کے آباء و اجداد بدخشاں سے ہندوستان آئے تھے، لیکن میر مذکور ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے، ثابت کی عمر کا ابتدائی حصہ الہ آباد میں گزرا لیکن بعد کو تلاش معاش میں انھیں دہلی جانا پڑا، اور آخری عمر میں وہ وہاں گوشہ نشین ہو گئے، ثابت کے آباء و اجداد سنی تھے، لیکن انھوں نے خود شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا، اور خوشگو کے بیان کے مطابق اس مذہب کی حمایت میں انھوں نے کچھ کتابیں نثر میں تصنیف کیں، لیکن اب ان میں سے کوئی دستیاب نہیں ہوتی، خوشگو ثابت کو ایک بلند پایہ شاعر قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔ "بے شائبہ تکلف کلیم روزگار و عرفی وقت خود ش می تواں گفت"[۲] آزاد بلگرامی نے بھی ان کی شاعری کو سراہا ہے اور شعر گوئی، شعر فہمی اور محاورہ دانی میں انھیں بے نظیر قرار دیا ہے، بھگوان داس ہندی اور احمد علی ہاشمی کے بقول انھوں نے پانچ ہزار اشعار کا دیوان مرتب کیا تھا لیکن خوشگو ان کے اشعار کی تعداد دس ہزار بتاتے ہیں، ثابت کی تاریخ وفات کے بارے میں بھی تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے، غلام علی آزاد ان کی وفات ۱۲ ربیع الاول ۱۱۵۰ھ میں بتاتے ہیں، بھگوان داس ہندی نے ان کا سال وفات ۱۱۵۱ھ لکھا ہے، اور بندرا بن خوشگو نے ان کی تاریخ وفات "ثابت مرد" سے نکالی ہے یعنی انکے نزدیک ان کا انتقال ۱۱۵۲ھ (مطابق ۱۷۳۹ء) میں ہوا،[۳] میر افضل ثابت کا نمونۂ کلام یہ ہے :

[۱] سفینۂ خوشگو، ص ۲۹۷ [۲] راقم الحروم کو خوشگو کی اس رائے سے اختلاف ہے، ثابت کے جو اشعار خوشگو نے بطور نمونۂ کلام سفینۂ خوشگو میں داخل کیے ہیں خود ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرفی اور کلیم کی برابری کا کیا سوال ثابت کا مرتبہ غنی کاشمیری اور ناصر علی سرہندی سے بھی کہیں پست ہے۔ [۳] سرو آزاد ص ۲۰۳۔ مخزن الغرائب (مخطوطہ علی گڑھ) ورق ۴۰ (الف) وسفینۂ خوشگو ص ۲۲۲ و سفینۂ ہندی ص ۴۴

مرد ہر دم قطع اسباب معیشت می کند　　ہر چہ می افتد بدست تیغ قسمت می کند

یار شمشیر بہ قصدِ سرِ ما کرد بلند　　می کشد خجلت ایں لطفِ نمایاں ما را

شمع افروختہ را کس نفروشد ثابت　　داغم و گرمی بازار ندارم چہ کنم

بہ خانہ اینشستم بغیر خانہ خویش　　شدم برنگ نگیں سنگ آستانہ خویش

ثابت کے بیٹے میر محمد عظیم ثبات (پیدائش در ۱۱۳۰ھ مطابق ۱۷۱۸ء) بھی ایک طباع و خوش فکر شاعر تھے، جنھیں واله اور آرزو دونوں اپنا شاگرد بتاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ریاض الشعرا کی ترتیب میں ثبات نے والہ کی بہت مدد کی تھی، فن شعر میں ثبات کی وسعت نظر کے متعلق احمد علی ہاشمی نے ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے، ایک روز کوئی شخص ان کے والد میر ثبات کا کوئی شعر شیخ علی حزیں کے پاس لے گیا، شیخ نے اسی کاغذ پر لکھ دیا کہ شعر کا مضمون فلاں شاعر سے لیا گیا ہے، ثابت کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو چند ہی روز میں انھوں نے دیوان حزیں سے تقریباً پانچ سو اشعار ایسے نکال دیے جن کے مضامین دوسروں سے ماخوذ تھے، صاحب شمع انجمن کے بقول ثابت نے اپنا جو مجموعۂ اشعار خان آرزو کے پاس اصلاح کے لیے بھیجا تھا، اس میں تقریباً چار ہزار اشعار تھے،[۱] ثبات کا نمونۂ کلام یہ ہے :۔

دل را نوید آمدنِ او نمی دہم　　ترسم بحال خود نگذارد دگر مرا

چوں شمع تا فتاد بہ بزمت گزر مرا　　با اشک و آہ زندگی آمد بسر مرا

گفتمش قتل من خستہ چساں خواہی کرد　　گفت گاہے بہ تغافل بہ نگاہے گاہے

با آنکہ ہمہ عمر نرفتم ز در او　　پرسد ز من از ناز ترا خانہ کدام است

چوں دانہ عنب کہ بپیچد بہ برگ تاک　　از کف نمی دہم من بیباک شیشہ را

[۱] شمع انجمن، ص ۱۰۴۔ مخزن الغرائب (مخطوطہ علی گڑھ) ورق ۴۰ (ب)۔ سفینۂ ہندی، ص ۵۴

دیگر چگونہ خاطر من وا شود کہ یار
چو بیندم زد و گرہ بر جبیں زند

جز محفل تصویر دریں باغ ندیدم
بزمے کہ کسی را بکسے کار نباشد

شیخ اسد اللہ غالب جونپور کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اور شیخ محمد افضل کے نواسے تھے، اس تعلق سے عموماً الہ آباد میں قیام پذیر رہتے تھے، جب علامہ آزاد بلگرامی بروز طلوع ہلال رمضان المبارک ۱۱۴۷ھ میں الہ آباد آئے تو غالب نے ان کا حسب ذیل رباعی سے استقبال کیا۔[1]

چوں کرد ورود سوے ما یار سعید
فی الحال مہ نو بہ فلک گشت پدید
از بسکہ فزود عشرت از آمدنش
ماہ رمضاں برائے من شد مہ عید

غالب نے اپنی زندگی کے آخری ایام شاہجہاں آباد میں بسر کیے اور وہیں نویں ذیقعدہ ۱۱۶۳ھ (مطابق ۱۷۵۰ء) کو انتقال کیا، اسی سال شیخ محمد ناصر افضلی کا بھی انتقال ہوا تھا، غلام علی آزاد نے دونوں کی تاریخ وفات کہی ؎

افضلی شیخ کامل و غالب
آرمیدند در ریاض ارم
سال تاریخ گفت غمزدہ
آہ رفتند ہر دو زیں عالم ۱۱۶۳ھ

غالب کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

دل دیوانۂ دارم کہ خاموشیست تقریرش
بزنگ زلف خوباں بے صدا افتاد زنجیرش

روز محشر غبار تربت ما
دامن بوتراب می خواہد

شاہ خوب اللہ کے تینوں بیٹے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے، علامۂ وقت ہونے کے ساتھ ساتھ خوش فکر شاعر بھی تھے، اگرچہ ان میں سے کسی نے بھی شاعری کی طرف پوری توجہ نہیں کی

[1] سرو آزاد، ص ۲۲۰ - شمع انجمن، ص ۳۴۲

شیخ محمد طاہر طاہر (متوفی ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۳۰ء) کا نمونۂ کلام یہ ہے:-

عشق یوسف کرد در پیری زلیخا را جواں
عشق رویت پیر کرد اندر جوانیہا مرا

شد زبانم بند تا دل محو شد در یاد دوست
بہتر است از صد زباں ایں بے زبانیہا مرا

گو بایار حرف ناملائم
رگ گل طاقت نشتر ندارد

ایں باد دلفریب کہ در کوئے دلبر است
یاد از نسیم گلشن فردوس می دہد

حیف است باغباں اگر از رشک عندلیب
گل را کند حوالہ بہ نوک سنان خار

بر زعم من بدست رقیبش سپردہ اند
تا کے کشم شکایت محمل کشان یار

شیخ طاہر کے چھوٹے بھائی شیخ محمد فاخر کا ذکر بھی اوپر ہو چکا ہے، وہ ابتداءً فاخر تخلص کرتے تھے لیکن زیارت حرمین کے بعد انھوں نے زائر تخلص اختیار کیا تھا، وہ صاحب دیوان شاعر تھے،[1] ان کا رنگ کلام حسب ذیل اشعار سے ظاہر ہوگا۔

کنند گور پرستاں زیارت زاہد
کہ زیر گنبد دستار زندہ در گور است

حب دنیا می فزاید خاطر افسردہ را
گوشمالی می دہد روباہ شیر مردہ را

بر میاں بر زدہ داماں ز کجا می آئی
مرحبا گرم بہ شکار دل ما می آئی

شیخ طاہر کے دوسرے بھائی شیخ محمد ناصر افضلی تخلص کرتے تھے، یہ بھی صاحب دیوان تھے، ان کے حسب ذیل اشعار سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

صفائے خاطر روشن دلاں ہمیں سخن است
چو صبح صافی آئینہ ام ز دم زدن است

لب گزیدۂ اغیار را چو بوسہ زنم
عقیق کندہ نام دگر چہ کار آید

سخن چو بہ میرد شعرا و مشہور تر گردد
کہ صافی تر کند گرد یتیمی آب گوہر را

[1] سرو آزاد ص ۲۰۲

من نغمہ سنجم و دل افسردہ در بغل　　انفاس عیسوی بلب و مردہ در بغل[1]

اسی زمانہ میں دربار دہلی کے ایک اہم رکن عمدۃ الملک نواب امیر خاں یزدی انجام بھی بحیثیت صوبہ دار الہ آباد میں مقیم تھے، ۱۱۵۲ھ (مطابق ۱۷۳۹ء) میں وہ بخشی گیری کے عہدہ پر مامور ہوئے، لیکن محمد شاہ کی بے تکلف صحبتوں میں آداب شاہی کو ملحوظ نہ رکھنے کے باعث ۱۱۵۹ھ (مطابق ۱۷۴۶ء) میں انھیں خود بادشاہ کے اشارہ سے قتل کر دیا گیا، "غم عمدۃ" تاریخ وفات ہے،[2] انجام موسیقی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، اور خوش فکر شاعر بھی تھے، عبد القادر بیدل سے مشورۂ سخن کرتے تھے، نمونۂ کلام یہ ہے:۔

شنیدم از زبان شمع روشن گشت بر من ہم　　کہ یک شب[1] ستلا خلق جاں بگذار و تن ہم

گر خرابم کنی اے عشق چناں کن باشے　　کہ نیاید دگرم منتِ تعمیر کشید

اسد یار خاں انسان بھی اسی دور کے شاعر تھے، جو فارسی اور اردو دونوں میں کہتے تھے، امیر خاں انجام کے ساختہ پرداختہ تھے، وہ اگرچہ اکبر آبادی تھے، لیکن کچھ زمانہ تک انجام کے ساتھ الہ آباد میں رہے تھے، نمونۂ کلام حسب ذیل رباعی ہے،[3]

گر با صنم شفیق می باید زیست　　ور تنہا بے رفیق می باید زیست

انسان ایں بزم جائے شکر دگلہ نیست　　یک چند بہر طریق می باید زیست

انجام سے کسب فیض کرنے والوں میں بندرابن خوشگو بھی تھے، اپنے قیام الہ آباد کے زمانہ میں خوشگو انجام کے دربار سے وابستہ تھے، اور دو روپیہ یومیہ بطور جیب خرچ پاتے تھے، خوشگو کے قیام الہ آباد کی صحیح مدت کا پتہ نہیں چلتا، لیکن قیاس یہ ہے کہ انھوں نے سفینۂ خوشگو الہ آباد میں مکمل کیا اور اسے عمدۃ الملک انجام کے نام معنون کیا، خوشگو اگرچہ سراج الدین علی خاں آرزو کے

[1] اسی مضمون سے ملتا جلتا عرفی شیرازی کا حسب ذیل شعر بھی ملاحظہ ہو:۔

ما تشنہ لب و چشمۂ حیواں نفس است　　درویش جہانیم و ہما در قفسِ ماست

[2] سفینۂ ہندی، ص ۷۔ خمخانۂ جاوید ج ۱ ص ۲۸۵ [3] تذکرۂ روز روشن، ص ۸۔

شاگرد تھے، لیکن انھوں نے اپنے عہد کے تمام اساتذہ مثلاً عبد القادر بیدل، محمد افضل سرخوش، سعد اللہ گلشن وغیرہ سے بھی فیض حاصل کیا تھا، اور بقول لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی اسم باسمی تھے، "خوشگو اسمت بامسمی و عندلیب است رنگین نوا ......" مخزن الغرائب اور گل رعنا کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخر زمانۂ عمر تک الہ آباد میں مقیم رہے، لیکن ۱۱۷۰ھ (مطابق ۱۷۵۶ء) میں ان کا انتقال عظیم آباد (پٹنہ) میں ہوا،[1] خوشگو کا نمونۂ کلام یہ ہے:۔

چند معمار دل ویرانِ من خواہی شدن　　ایں سرائے نامبارک قابلِ تعمیر نیست

آواز تیشہ امشب از بے ستوں نیاید　　شاید بخواب شیریں فرہاد رفتہ باشد

موجود گر نبودیم معدوم ہم نبودیم　　امروز از کجا ئیم گر در عدم نبودیم

برائے یار تعظیم رقیباں ہم ضرور افتد　　بہ شوق بت نخستین سجدہ در پیش برہمن کن

ہر کہ رخت سفر از دار فنا می بندد　　محمل داغ بدوشِ دل ما می بندد

شیخ غلام قطب الدین مصیب (پیدائش ۱۱۳۸ھ (مطابق ۱۷۲۵ء) وفات ۱۱۸۷ھ مطابق ۱۷۷۳ء) شیخ محمد فاخر کے صاحبزادے اور شاہ اجمل الہ آبادی کے برادر بزرگ تھے، تحصیل علم ملا برکت اللہ الہ آبادی اور ملا کمال الدین لکھنوی سے کی، مصیب جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے، عربی فارسی، اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، مظفر حسین صبا گوپاموی کے بیان کے مطابق حقیقت بستان اور نان و قلیہ دو مثنویوں کے مصنف تھے،[2] نمونۂ کلام یہ ہے:۔

کمرۂ پیراہن گلگوں قبائے دیدہ است　　از خجالت دیدہ ام سر در گریباں غنچہ را

سبو بدوش بہ بزم بت یگانہ بیا　　بگو کہ بادہ فروشم بدیں بہانہ بیا

شبہا بکوئے یار گذر می کنیم ما　　از سر چو شمع قطع نظر می کنیم ما

[1] سفینۂ خوشگو، دیباچہ۔ مخزن الغرائب۔ گل رعنا۔ قاموس المشاہیر، ج ۱ ص ۱۳۲۔ سفینۂ ہندی، ص ۶۷، [2] روز روشن ص ۶۳۱۔ شمع انجمن ص ۴۳۱۔ تذکرہ میر حسن ص ۱۵۸۔ گلزار ابراہیم ص ۱۸۔ قاموس المشاہیر، ج ۲ ص ۱۱۲

در حلقہ حلقہ خود صد دل نگاہ دارد　　یک سر ہزار سودا گیسوے یار دارد

شب فراق بیادت ز دیدۂ ترِ ما　　کدام چشمہ کہ طوفاں نکرد بر سرِ ما

مردیم و ہنوز بر لبِ من　　چوں شمع فسردہ دودِ آہ است

گاہ در بتکدہ گاہے بہ حرم سیر کند　　یار غارتگرِ دین است خدا خیر کند

ز بلبل باغبانِ بے مروت سرگراں دارد　　کہ ایں بے خانماں ماتم چرا در گلستاں دارد

شاہ محمد علیم حیرت شاہ خوب اللہ کے نواسے اور مصیبؔ کے ماموں زاد بھائی تھے، علوم مروجہ ملا محمد فصیح جونپوری اور اپنے ماموں شیخ محمد ناصر سے حاصل کیے، بلند پایہ فارسی کے شاعر ہونے کے ساتھ فارسی نثر نگار بھی تھے، قافیہ شرح شافیہ، جواہر زواہر اور مثنوی شیر و برنج انکی تصانیف ہیں، ۱۲۲۳ھ (مطابق ۱۸۰۸ء) میں تقریباً نوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا،[1]

نمونۂ کلام یہ ہے:-

چہ پرسی باغباں در گلشنِ ہستی ز سامانم　　بسانِ غنچہ دل تنگم برنگِ گل پریشانم

ہمچو طفلِ بے پدر بے اعتبار افتادہ ام　　قطرۂ اشکم ز چشمِ روزگار افتادہ ام

چوں صبح کہ از مطلعِ خورشید ہویداست　　چاکِ دلم از چاکِ گریبانِ تو پیداست

کثرت از وحدت او بسکہ بجوش است امشب　　یار در خانۂ آئینہ فروش است امشب

شاہ محمد علیم کے بیٹے شاہ محمد اعلیٰ اعلیؔ کا ذکر نور الحسن خاں نے اس عہد کے شعرا میں کیا ہے،[2] مصیبؔ کے چھوٹے بھائی شاہ محمد اجمل (پیدائش ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء، وفات ۱۲۳۶ھ مطابق ۲۱-۱۸۲۰ء) جن کے نام سے دائرہ شاہ اجمل مشہور ہے، مشہور بزرگ اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی تھے، میر حسن دہلوی اور بھگوان داس ہندی دونوں کو انکی زبان سے شعر سننے کا شرف حاصل ہوا تھا، ہندی کو انھوں نے اپنا مجموعۂ کلام دکھایا تھا، اس میں تقریباً دو ہزار اشعار تھے، میر حسن کا کہنا ہے کہ شاہ اجمل کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہا کرتے تھے، اور

[1] تذکرہ روز روشن ص ۱۸۹، [2] نگارستان سخن، ص ۹

نثر میں بھی چند کتابوں کے مصنف تھے،[1] نمونۂ کلام یہ ہے:-

بود خموشی حیرت ترانۂ دلِ ما　　رسد چگونہ بگوشش فسانۂ دلِ ما

اقلیمِ دل بعشقِ تو ویرانہ گشتہ است　　آئینہ خانہ بود پری خانہ گشتہ است

آدم از عدم و طرفہ تماشا دیدم　　روے نادیدنیٔ مردمِ دنیا دیدم

ہنوز آں شورشِ عشق است در زیرِ غبارِ من　　کہ دود سینہ باشد سایہ گستر بر مزارِ من

برگشتنِ چشمِ یار دیدم　　نیرنگیٔ روزگار دیدم

سفینۂ ہندی کے مشہور مصنف بھگوان داس ہندی (پیدائش ۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۵۰ء) اگرچہ صوبہ بہار میں پیدا ہوئے تھے اور لکھنؤ میں پرورش پائی تھی، لیکن الہ آباد سے انکا خاص تعلق تھا، آغاز جوانی میں وہ صوبہ الہ آباد میں نواب مختار الدولہ بہادر کی طرف سے میر بحری کی خدمت پر مامور ہوئے تھے، اس سلسلہ میں کافی عرصہ الہ آباد میں مقیم رہے، ابتداءً بسملؔ تخلص کرتے تھے، بعد میں ہندیؔ اختیار کیا تھا، سفینۂ ہندی میں اپنے حالات کے ضمن میں اپنی تصانیف میں تین مثنویوں، سلسلۂ محبت، مظہر الانوار، اور مہر ضیاء (بھاگوت گیتا کا فارسی ترجمہ)، دو دیوان شوقیہ اور ذوقیہ اور دو تذکرۂ شعرا حدیقۂ ہندی اور سفینۂ ہندی کا ذکر کیا ہے، لیکن ان میں سے آخر الذکر کے سوا اور کسی کا سراغ نہیں ملتا، ہندی کا نمونۂ کلام یہ ہے:-

بہ بزمِ یار ز مجنوں فسانہ می خواہد　　برائے گریہ دلِ من بہانہ می خواہد

شب از تبِ جدائی جانانہ سوختیم　　آتش گرفتیم از جگر و خانہ سوختیم

کافر بکفر و دیں نبود طالبِ ترا　　آتش زدیم بہ کعبہ و بتخانہ سوختیم

بالم شکستہ از قفس آزاد می کند　　صیادِ سنگدل ستم ایجاد می کند

برائے آنکہ نیابد کسے نشانِ مرا　　سگانِ کوئے تو خوردند استخوانِ مرا

تا چند سخن سخن گزارید　　یکچند مرا بمن گزارید

[1] سفینۂ ہندی ص ۱۱، تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) ص ۱۲، گلشن ہند ص ۴۴، روز روشن ص ۲۵، گلشن سخن ص ۴۴

خوباں کشیدہ از کمر زلف زنار بہ برہمن گزارید

آں شوخ در آئینہ رخ خود را دید بر عکس نگاہ چوں فتادش خندید

شد والہ عکس خویش و آئینہ زناز آورد بہ پیش روئے و رویش بوسید

سید شاہ علی جعفر جعفر ابن شاہ علی رضا، شاہ محمد اجمل کے داماد تھے، اور بقول صبا "ارباب عرفان و کمال میں سے تھے، کتب درسیہ مولوی احمد الہ آبادی سے پڑھیں، ۱۲۴۹ھ (مطابق ۱۸۳۳ء) میں وفات پائی [1] نمونہ کلام یہ ہے :۔

بہ وصف رخسار و قامت او ز نوک کلکم چہ نقش برزد خداست یا در د احمر است ایں قد است یا سرو گلشن ارا

وصال ممکن بہ زندگی کو ولے الیقیں شد کہ بعد مردن صبا رساند بہ کوئے آں ماہ مشت خاکے ز تربت ما

دی جمال تو جہاں اے بت زیبا دیدم روئے گل بوئے سمن خوئے مسیحا دیدم

شاہ محمد اجمل کے فرزند رشید شاہ ابو المعالی عالی (پیدائش ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۱ء، وفات ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء) بھی صاحب فضل و کمال و حال و قال" تھے، کتب درسیہ اخوند محمد سلطان رامپوری سے پڑھی تھیں، فارسی اشعار کی اپنے والد سے اور اردو اشعار کی میر تقی میر سے اصلاح لیتے تھے، صاحب دیوان شاعر تھے [2] نمونۂ کلام درج ذیل ہے :۔

رفتی ز پہلوئے من و غم شد قرین مرا دشمن بجائے دوست بود ہم نشیں مرا

تو غافل ماندۂ افتادہ بر ساحل چہ می دانی کہ دارد در بغل ہر قطرہ بحر بیکرانے را

بیاد روئے از کون و مکاں بر داشتم دل را زمن برداشتی دل از جہاں برداشتم دل را

بابروئے تو دل من مقابل افتاد ست چو خوں گرفتہ بہ شمشیر مائل افتاد ست

رقیب دشمن و دل دشمن و فلک دشمن بکوئے دوست مرا سخت مشکل افتاد ست

دولت فقر ست سلیمانیم ننگ بود شاہی و سلطانیم

[1] تذکرہ روز روشن ص ۱۴۵ [2] ایضاً ص ۴۲۹

ہر لباسم بہ مقام فنا بس بود ایں جامہ عریانیم

می روم از دیر بہ عزم حرم کافرم و گبرم و مسلمانیم

بردۂ از دلم قرار عشوہ گرا تو کیستی راست بگو جفا شعار بہر خدا تو کیستی

چوں نکنم ز رشک تو جامہ خویش را قبا بر کمرش گرہ زدی بند قبا تو کیستی

مرزا محمد فدا الہ آبادی کے دادا جعفر علی خاں، نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور دہلی میں مقیم ہوئے تھے، ان کے والد مرزا محمد اسمٰعیل امیر الامرا نجف خاں کے زمانہ میں رسالدار تھے، عرصۂ دراز تک جلیسر میں مقیم رہے، بعد میں الہ آباد چلے آئے جہاں فدا نے ۱۲۰۰ھ (مطابق ۱۷۸۵ء) میں پیدا ہوئے، انکے حالات زیادہ نہیں ملتے، اتنا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے آفتاب عالمتاب انگریزوں کی ملازمت کے زمانہ میں تصنیف کی تھی [1]، نمونہ کلام یہ ہے :۔

یارب بہ دلے راہ مدہ مہر بتاں را بر سنگ مزن شیشۂ ناموس جہاں را

بر و اجل کرد داعی ز دلربا باقیست کجاست فرصت مردن کہ کار با باقیست

ز حال شدت بیمار خود چہ می پرسی گزشت وقت دوا نوبت دعا باقیست

شکوہ ام نیست ز ناسازی ایام فدا باکہ کردست وفا دہر کہ با ما می کرد

علی کبیر میر نجان بن شاہ علی جعفر کا ذکر بھی فارسی نثر نگاروں کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، وہ شاہ محمد اجمل کے نواسے تھے، ماں اور باپ دونوں کی طرف سے انکا شجرہ شاہ خوب اللہ تک پہنچتا ہے، ۲۸ محرم ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء) کو الہ آباد میں پیدا ہوئے، پہلے اجملی اور بعد میں سید تخلص اختیار کیا، ایک دیوان اور چند مثنویوں کے مصنف ہیں [2]، نمونۂ کلام یہ ہے :۔

آں بے وفا نکرد گزر بر مزار ما مردن ہزار حیف نیامد بہ کار ما

ہر لحظہ دل سوختہ ام گرم فغان ست امشب مگر آں شمع بہ بزم دگران ست

دیر آمدم ز باغ عدم لیک مثل گل از بوستان دہر چو افسانہ می روم

[1] تذکرہ روز روشن ص ۱۴۳ [2] ایضاً ص ۳۱۰

اسی زمانہ کے ایک اور فارسی گو شاعر بھکاری داس عزیز تھے، جو بقول بھگوان داس ہندی ایک پرگو شاعر تھے، اور انکے دوران قیام الہ آباد میں اکثر ان سے ہم صحبت رہتے تھے، شاہ عالم نے اپنے قیام الہ آباد کے زمانہ میں انھیں شاہ نامہ لکھنے کی خدمت سپرد کی جسے انھوں نے کچھ حد تک انجام دیا تھا[1]، بھگوان داس ہندی نے بادشاہ کی محفل میں رقاصوں سے متعلق ان کا حسب ذیل شعر نقل کیا ہے :-

شد ندے جو از بادۂ رقص مست
سرہائے شان دل ربوئے ز دست

شاہ محمد حسین اشرت حکیم فخر الدین احمد کے بڑے بھائی تھے، زیادہ تر نعت کہتے تھے، ایک مختصر دیوان فارسی کے علاوہ انھوں نے ایک مختصر فارسی مثنوی معدن فیض بھی تصنیف کی تھی[2]، شاہ غلام اعظم افضل الہ آبادی شاہ ابو المعالی خامی کے فرزند رشید تھے، اور "علم و کمال" کے ساتھ ساتھ حسن و جمال بھی رکھتے تھے، علوم عربیہ سید زین الدین سے پڑھے تھے، کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہتے تھے جس کا نمونہ یہ ہے[3] :-

ہست مطلوب تو موجود عجب جائے ہست
در دل خویش نظر کن کہ تماشائے ہست

خون گرمی است از رخت امشب شراب را
گویا فشردہ اند بہ جام آفتاب را

میر زین الدین بیمار شاہ افضل کی اولاد میں تھے، شاہ محمد علیم حیرت سے مشورۂ سخن کرتے تھے، نمونۂ کلام یہ ہے[4]

نالۂ بلبل کجا رنگینیٔ آہم کجا
دادہ ام صد غوطہ در خون جگر فریاد را

بیمار در دل تو ندانم چہ درد بود
بیمار کرد درد تو بیمار دار را

مذکورۂ بالا شعراء کے علاوہ اس دور میں چند ایسے شعراء بھی تھے جو اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ ان میں شاہ محمد علیم بیتاب اور شاہ غلام حسین محزون قابل ذکر ہیں۔

(باقی)

---

[1] سفینۂ ہندی، ص ۱۳۱ [2] نگارستان سخن، ص ۸ [3] تذکرۂ روز روشن، ص ۱۱۰ [4] الضاً، ص ۱۱۸

ٹونک کے قدیم مدارس

اور

کتب خانے

از جناب حکیم محمد عمران خاں صاحب ٹونکی بی اے
سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک

ریاست ٹونک راجپوتانہ کی وہ مختصر ترین ریاست ہے جو عمر میں بہت کم اور رقبہ میں بہت چھوٹی ہونے کے باوجود اپنے بانی نواب امیر خاں کے بہادرانہ جنگی کارناموں اور یہاں کے علمی خانوادوں کے تعلیمی و علمی خدمات کی وجہ سے تاریخ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیشہ زندہ رہے گا، ۱۸۱۷ء ۱۲۳۲ھ میں انگریزوں کے تدبر سے یہ ریاست قائم ہوئی، ۱۹۴۷ء میں ۱۳۰ سالہ زندگی پوری کر کے ہندوستان کے ہمہ گیر انقلاب میں اس کا خاتمہ ہوا،

اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں نواب امیر خاں کی بہادری کا دور دور تک سکہ جما ہوا تھا، ابھرتی ہوئی فرنگی طاقت سے یہ درد سر کس طرح برداشت ہو سکتا تھا، اس لیے امیر خاں کو کسی نہ کسی طرح زیر کر لینا ضروری سمجھا گیا، اس کے نتیجہ میں نومبر ۱۸۱۷ء میں ریاست ٹونک وجود میں آئی۔

نواب امیر خاں فوجی سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ نیک خیال، علم دوست، علم نواز اور مذہبی جذبات کے انسان تھے جن کے ساتھ لشکر کشی کے زمانہ میں بھی علماء و صلحاء کا ایک گروہ رہا کرتا تھا، اس لیے ریاست کے قیام کے بعد ہی ذی علم اور باکمال حضرات اس

تو مولود ریاست کی طرف کھنچ کھنچکر آنے لگے، جدید شہر کی بنیاد پڑی، محلے اور گنج قائم ہوئے اور شاہی محلات کی تعمیر کے ساتھ ساتھ مساجد، معابد اور مدارس وغیرہ کی بھی تعمیر ہونے لگی، اس طرح دس بیس سال کی مدت میں یہ ریاست علم و فضل، درس و تدریس اور فضل وکمال کا بھی مرکز بنگئی، بانی ریاست نواب امیر خاں کا دور ۱۸۱۷ء/۱۲۳۲ھ سے شروع ہو کر ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ پر ختم ہوتا ہے،

اس ابتدائی دور میں ٹونک میں کافی آبادی ہوگئی تھی، اور متعدد علمی خاندان ترک سکونت کرکے مستقل طور پر یہاں آباد ہو چکے تھے، اس دور کی ممتاز شخصیتوں کے ذمہ مختلف خدمات سپرد تھیں، حکیم انور علی[1] نواب وزیر الدولہ کے اتالیق تھے، مولوی خلیل الرحمٰن[2] درسی خدمات انجام دیتے تھے، مولوی کلیم اللہ، مولوی سید احمد اور مولوی سید نور جدید آبادی میں ہونہار نوجوانوں کی تعلیم و تدریس پر مامور تھے، قیام ریاست کے بعد ہی دیگر عمارات کے ساتھ ساتھ جامع مسجد

---

[1] یہ رامپور کے رہنے والے تھے، قیام ریاست سے بہت قبل ۱۲۱۲ھ سے نواب امیر خاں کے ساتھ رہتے تھے، ۱۲۲۳ھ میں نواب وزیر الدولہ پیدا ہوئے، آگے چل کر حکیم انور علی خاں انکے اتالیق مقرر ہوئے، قیام ریاست کے بعد بھی علمی وطبی خدمات انجام دیتے رہے، ۱۸۵۶ء/۱۲۷۳ھ میں بزمانہ نواب وزیر الدولہ ٹونک میں انتقال ہوا، استاد سید اصغر علی ابرو مصنف تاریخ ٹونک آپ ہی کے فرزند تھے۔

[2] مولانا خلیل الرحمٰن، ملا عرفان رامپوری مصنف "دوّار" و "مدار" حواشی دائر شرح منار کے صاحبزادے تھے، عرفان، مولانا بحر العلوم لکھنوی کے تلامذہ میں سے تھے، اور متاہل ہو کر رامپور میں سکونت اختیار کرلی تھی، موصوف اور نواب امیر خاں کے خسر اخوند محمد ایاز خاں تحصیل علم کی غرض سے ایک ساتھ ہندوستان آئے تھے، اس لیے قیام ریاست کے بعد ملا عرفان رامپوری کی اولاد میں مولانا خلیل الرحمٰن، مولوی محمد مفتی اور مولوی سعد اللہ خطیب ٹونک منتقل ہوگئے، مولانا خلیل الرحمٰن تاحیات نواب امیر خاں ٹونک ہی میں درسی خدمات انجام دیتے رہے، ۱۲۵۲ھ میں بزمانہ نواب وزیر الدولہ بعض اختلافی مسائل کی بنا پر ترک سکونت کرکے ٹونک سے چلے گئے، اور ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ میں گلشن آباد جاورہ میں انتقال کیا، صاحب تصنیف کثیر تھے، موصوف راقم کے جد امجد مولوی محمد مفتی کے حقیقی بھائی تھے۔

کی وسیع اور خوشنما عمارت بھی تعمیر ہوگئی تھی، اور دفتر شریعت کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا، اسلیے مولانا خلیل الرحمٰن کے دونوں بھائی مولوی محمد مفتی[1] اور مولوی سعد اللہ خطیب[2] کو رامپور سے طلب کیا گیا، مولوی محمد صاحب کے عدالتِ شریعت سپرد ہوئی اور مولوی سعد اللہ صاحب کو جامع مسجد کا خطیب و امام مقرر کیا گیا۔

ابتدائی دور میں جدید آبادی جس تیزی سے بڑھ رہی تھی، اسی تناسب سے درس و تدریس اور تعلیم و تعلم میں بھی اضافہ ہو رہا تھا، مگر وہ دور مدارس کا نہیں تھا، ابتدائی تعلیم مکاتب کے ذریعہ ہوا کرتی تھی، اور ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ہر باکمال کی ذات تعلیم کا مرکز ہوتی تھی جس سے طلبہ دور دور سے آکر فیض حاصل کرتے تھے، اس لیے ابتدائی دور میں صرف دو مدرسوں کا پتہ چلتا ہے، جو درس و تدریس کا مرکز بنے ہوئے تھے، اول "مولانا خلیل الرحمٰن کا مدرسہ" جس کی منہدمہ عمارت موتی باغ کے وسط میں اب بھی باقی ہے، اور مولانا صاحب کے مدرسہ کے نام سے معروف ہے، مدرسہ کے ایک گوشہ میں ایک مختصر کچی مسجد بھی ہے، اس دور میں ولایتی طلبہ کا جمگھٹ اس مدرسہ میں لگا رہتا تھا، اور تشنگانِ علم دور دور سے یہاں آکر فیض حاصل کرتے تھے، تذکرہ علمائے ہند میں مولانا رحمٰن علی نے لکھا ہے کہ مولوی عبد الفتاح گلشن آبادی نے بھی ٹونک پہنچکر مولانا خلیل الرحمٰن سے تلمذ حاصل کیا، وہ اسی مدرسہ کے فارغ شدہ ہیں،

---

[1] ملا عرفان رامپوری کے بڑے بیٹے تھے، رامپور میں محلہ راجدوارہ میں آپ کی مسند درس قائم تھی، قیام ریاست کے بعد خدمتِ افتاء وقضاء آپ کے سپرد ہوئی، درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، ۱۸۴۹ء/۱۲۶۵ھ میں ٹونک میں انتقال کیا، موصوف احقر کے جد امجد تھے،

[2] آپ بھی ملا عرفان رامپوری کے بیٹے تھے، جامع مسجد امیر گنج تعمیر ہوئی تو اس کے پہلے امام و خطیب مقرر ہوئے اور تاحیات یہ خدمت انجام دیتے رہے، ۱۸۵۳ء/۱۲۶۹ھ میں ٹونک میں انتقال ہوا،

۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں نواب وزیر الدولہ تخت نشین ہوئے، بعض اختلافی مسائل کی بنا پر ان سے اور مولانا خلیل الرحمٰن کی نہیں بنی، چنانچہ ۱۲۵۲ھ کے بعد مولانا خلیل الرحمٰن ٹونک سے ترک سکونت کرکے جاورہ چلے گئے، ان کے جانے کے بعد یہ مدرسہ ویران ہوگیا، موتی باغ بھی گورستان بنادیا گیا، تقریباً چالیس سال کے بعد رؤسائے ٹونک نے اسی تالاب موتی باغ کے شمالی جانب ایک عمارت مدرسہ کے لیے تعمیر کرائی، اور اس کا نام "مدرسۂ خلیلیہ"[1] رکھا گیا، یہ مدرسہ بھی ایک زمانہ تک چلتا رہا۔

نواب امیر خاں کے دور میں دوسرا قدیم مدرسہ جس کا پتہ چلتا ہے، "مولوی محمد رضا صاحب مفتی کا مدرسہ"[2] تھا، موصوف نواب امیر خاں کی طلب پر رامپور سے ٹونک آئے اور محکمۂ شریعت کے مفتی مقرر ہوگئے، درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، محلہ امیر گنج میں اپنے رہائشی مکان کے قریب ایک مسجد تعمیر کرائی[3]، مدرسہ کی خام عمارت اسی مسجد کے متصل واقع تھی، اسی میں مولانا درس دیا کرتے تھے، مولوی شاہ عالم صاحب ٹونکی وغیرہ اسی مدرسہ کے فارغ التحصیل افراد میں سے تھے، ۱۹۳۶ء میں یہ خام حصہ مسجد میں شامل کرلیا گیا اور اب اس مقام پر مسجد مذکور کا وسیع حوض تعمیر ہوگیا ہے۔

ان دونوں مدرسوں کے علاوہ اس دور میں کسی اور مدرسہ کا پتہ نہیں چلتا، البتہ جدید آبادی کے مختلف حصوں میں مختلف حضرات تعلیم کے لیے مقرر تھے، چنانچہ مولوی کلیم اللہ مسجد وزیر باغ میں اور مولوی عبید اللہ اور مولوی سید احمد آبادی کے دوسرے حصہ میں درس دیتے تھے۔

نواب وزیر الدولہ کے دور میں علمی کاموں اور درس و تدریس کے سلسلہ میں کافی ترقی ہوئی، اس

---

[1] تاریخ ٹونک اردو، ص ۱۵۔ [2] حافظ احمد علی خاں شوق "تذکرہ کاملان رامپور" میں لکھتے ہیں: "مولوی غلام جیلانی رفعت کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، کتب فقہ پر اچھی طرح عبور تھا، درس و تدریس ان کے مکان پر ہوتا تھا، حدیث و فقہ میں اچھی مہارت تھی، محلہ راجہ دوارہ میں جو اونچا محلہ کہلاتا تھا وہ انہی کا تھا، مکان کا بڑا دروازہ خام تھا، اندر کا مکان خام بھی اچھا تھا۔" [3] یہ مسجد اب والد مرحوم مولوی حکیم محمد عرفان خاں صاحب ناظم عدالت شریعت کے نام سے موسوم ہے، مولوی محمد صاحب آپ کے جد امجد تھے۔

حیثیت سے یہ دور سنہری دور شمار کیا جاسکتا ہے، اس زمانہ میں بیشمار علمی خاندان ٹونک منتقل ہوکر آباد ہوئے، سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد آپ کے متعلقین، نواب وزیر الدولہ ہی کے دور میں ٹونک آکر آباد ہوئے تھے جس مقام پر اس قافلہ کا قیام ہوا تھا، پورا محلہ "محلہ قافلہ" کے نام سے آباد ہوگیا، جو فوجی دستے سادات کے اس قافلہ کی حفاظت کے لیے مامور ہوئے تھے، ان کے ناموں سے چاروں طرف کے محلے کالی پلٹن، رجمن (ریجمنٹ) اور غول (فوج کا ایک دستہ) آباد ہوگئے، جن علمی خانوادوں کو سید صاحبؒ سے تعلق تھا، وہ بھی رفتہ رفتہ ٹونک آکر آباد ہونے لگے، رؤسائے وقت نے انکی پوری ہمت افزائی اور قدر دانی کی، جن سے علمی و تعلیمی مشاغل میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا، مولانا حیدر علی رامپوریؒ اپنی قیام گاہ پر مسند درس بچھائی، شمس العلماء مولوی امام الدین اپنے مقام پر تشنگان علم کو سیراب کرتے رہے، تاج العلماء قلزم علوم مولانا نجف علی خاں قاضی جھجر تصنیف و تالیف میں مشغول تھے، مولوی سراج الرحمٰن مسجد قافلہ میں درس دیتے تھے، اسی طرح بعد کے دور میں مولوی محمد حسین خاں جلال آبادی محلہ چھاؤنی میں، مولوی محمد حسن خاں محلہ بھیر میں اور مولوی نور الحق خستہ اپنی قیام گاہ محلہ غول میں، مولوی بہادر علی دہلوی، مولوی عبد الحق ٹونکی، مولوی عبد الغفور بنگالی، حکیم دائم علی خاں، مولوی جان محمد پنجابی اپنے اپنے مقام پر تعلیم و تدریس میں مشغول تھے،

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، یہ دور قیام مدارس کا نہ تھا، بلکہ اصحاب علم و کمال کی قیام گاہیں علحدہ علحدہ ایک مدرسہ کی حیثیت رکھتی تھیں، البتہ ہر مسجد اور ہر محلہ میں مکتب کا ہونا ضروری تھا جس میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کا انتظام ہوا کرتا تھا، ایسے مکاتب کی تعداد اس دور میں بہت تھی،

موجودہ صدی ہجری کے اوائل سے قیام مدارس کا دور شروع ہوتا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ٹونک کے کچھ سپوتوں نے مقامی علماء سے حصول تعلیم کے بعد اس کی تکمیل کے لیے باہر قدم نکالا اور تکمیل کے بعد تعلیمی فیض جاری کرنے کے لیے اپنے وطن واپس آئے، چنانچہ حکیم برکات احمد صاحب، خیرآباد میں مولوی عبد الحق صاحب خیرآبادی سے، مولوی حیدر حسن خاں صاحب شیخ الحدیث و ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

لاہور میں مولوی غلام احمد صاحب نعمانی سے اور مولوی سیف الرحمن صاحب کابلی، مولانا رشید احمد گنگوہی سے سندِ فراغت حاصل کرکے ٹونک واپس تشریف لائے، اس زمانہ کے دستور کے مطابق ابتدا میں ان حضرات نے بھی اپنی اپنی قیام گاہ پر درس دینا شروع کیا، پھر یہ خیال ہوا کہ ٹونک میں ایک بڑا مدرسہ قائم ہونا چاہیے، وقت کے روشن خیال اور اہل خیر حضرات اس مشورہ میں شریک تھے، صاحبزادہ عبد الرحیم خاں مظفر جنگ[1] جو بڑے علم دوست اور علماء کے قدردان تھے، اس معاملہ میں پیش پیش تھے، ان کی کوششوں سے غالباً ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں دار العلوم خلیلیہ اور مدرسہ ناصریہ واقع مسجد قافلہ وجود میں آئے۔

دار العلوم خلیلیہ یہ مدرسہ ابتدا سے اس عمارت میں قائم ہے جہاں اس کی بنیاد رکھی گئی تھی، اور بحمد اللہ اب بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہے، علامۃ الہند مولانا حکیم برکات احمد صاحب کی سرپرستی میں اس مدرسہ کی ابتدا ہوئی تھی، اس وقت آپ کے والد ماجد حکیم دائم علی خاں صاحب، شاگرد حکیم احسن اللہ خاں طبیب شاہی، حیات تھے، حکیم صاحب نے مدرسہ کی ابتدا سے لیکر اپنی وفات تک اس مدرسہ کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دیں، حکیم صاحب کے درس کا چرچا اطراف واکناف عالم میں پھیلا ہوا تھا، دور دور سے طلبا کھنچ کھنچکر آتے اور آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے، ہندوستان کے علاوہ کابل، قندھار، سمرقند وبخارا وغیرہ کے طلبہ کا ایک ہجوم جمع رہتا تھا، شہر کے ہر محلے اور ہر مسجد میں ان کا قیام رہتا تھا، اور درس وتدریس کے مشاغل شباب پر تھے، چنانچہ علامہ مناظر احسن گیلانی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا عبد الرحمن چشتی، قاضی محمد عرفان ٹونکی، مولوی عبد السبحان بہاری، مولانا خواجہ بادشاہ کابلی وغیرہ اسی چمنستان علم کے گلہائے سرسبد تھے۔

۱۳۴۷ھ میں حکیم برکات احمد صاحب کا انتقال ہو جانے کے بعد ان کے خلف ارشد مولوی

---

[1] نواب محمد علی خاں والی سوم ریاست ٹونک کے بیٹے تھے۔ ٹونک کا مشہور تاریخی کتب خانہ آپ ہی کی طرف منسوب ہے، کہ نواب صاحب کے انتقال کے بعد موصوف نے اسکی قدر کی اور اس میں غیر معمولی اضافہ کیا اور ترقی دی، ۱۳۳۰ھ میں ٹونک میں انتقال ہوا۔

حکیم محمد احمد صاحب نے اپنے والد بزرگوار کی مسندِ درس کو قائم رکھا، لیکن افسوس عمر نے وفا نہیں کی، اور تقریباً دو ہی سال بعد ان کا بھی انتقال ہوگیا، ان دونوں کے علاوہ مولوی پُردل صاحب، مولوی عبد الرحمن چشتی، مولوی نصیر احمد صاحب ٹونکی، مولانا خلیل الرحمن ٹونکی اور مولوی منتخب الحق گورکھپوری وغیرہ نے بھی دار العلوم میں درسی خدمات انجام دیں، اب بھی یہ دار العلوم حسن وخوبی کے ساتھ تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، اور حالات حاضرہ کے مطابق ضروری مضامین اضافہ کردیے گئے ہیں، جامعہ اردو علی گڑھ کا سنٹر ہے اور حفظ قرآن وتجوید کا بہتر انتظام ہے۔

مدرسہ ناصریہ یہ مدرسہ صاحبزادہ عبد الرحیم خاں کی سرپرستی میں قائم ہوا، مولانا سیف الرحمن کابلی مدرس اول اور مولانا حیدر حسن خاں مدرس دوم مقرر ہوئے، ایک زمانہ تک یہ مدرسہ بھی علمی خدمات انجام دیتا رہا، صاحبزادہ عبد الرحیم خاں کے انتقال کے بعد مولانا حیدر حسن خاں، ندوۃ العلماء لکھنؤ تشریف لے گئے اور مولانا سیف الرحمن صاحب ترک سکونت کرکے اپنے وطن چلے گئے، پھر بھی مدرسہ اپنی خدمات انجام دیتا رہا، ۱۹۱۱ء سے مولوی محمد علی خاں خطیب جامع قافلہ کی سرپرستی میں ہے، مولوی جان محمد پنجابی اور مولوی عبد الرحیم صاحب مفتی نے بھی اس مدرسہ میں درس دیا ہے۔

مدرسہ فرقانیہ اس مدرسہ کے بانی مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ ہیں، اس مدرسہ کے قیام سے پہلے ٹونک میں تجوید قرآن کی تعلیم کا عام رواج نہ تھا، مولانا کو اس کمی کا احساس ہوا، چنانچہ ۱۹۲۵ء میں موصوف نے مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ کے نام پر ٹونک میں یہ مدرسہ قائم کیا، مولانا مرحوم کا یہ لگایا ہوا پودا ماشاء اللہ اب تک سرسبز وشاداب ہے، قیام مدرسہ کے بعد یہ فن اس علاقہ میں بہت پھیلا اور اس مدت میں بیشمار قراء، حفاظ اور علماء اس مدرسہ سے فارغ ہوکر نکلے، استاد القراء قاری عبد المالک صاحب لکھنوی، قاری مصطفیٰ صاحب مکی، قاری سابق صاحب اور قاری حبیب اللہ صاحب افغانی وغیرہ اساتذۂ فن نے اس مدرسہ میں تعلیمی خدمات انجام دیں،

قاضی محمد عرفان خانصاحب مرحوم نے جو اس مدرسہ کے بانیوں میں تھے، عربی کے درجات قائم کرکے اعزازی طور پر علوم عربیہ کی بھی خدمت انجام دی، اور مولوی منتخب الحق صاحب بہاری نے بھی اپنی صلاحیتوں سے اس مدرسہ کو فائدہ پہنچایا،

مدرسہ امیریہ ابتداءً یہ مدرسہ ۱۳۳۸ھ میں تالاب موتی باغ کی اس عمارت میں قائم ہوا تھا جس میں پہلے "مدرسہ خلیلیہ" تھا، مولوی جان محمد پنجابی اور مولوی عبدالحفیظ صاحب مفتی وغیرہ درس دیا کرتے تھے، مدرسہ کی عمارت کے قریب نواب امیر خاں کا مزار ہے، اسلیے "مدرسہ امیریہ" کے نام سے موسوم ہوا، ۵۸-۱۳۵۷ھ میں جب مولانا حید رحسن خانصاحب لکھنؤ سے واپس ٹونک تشریف لائے، اس وقت نواب سعادت علی خاں والی ریاست تھے، ان کے زمانہ میں توسیع و ترقی کے لیے مدرسہ جامع مسجد امیر گنج ٹونک کے غرب کیجانب جو نیا ہال تعمیر ہوا تھا، اُس میں منتقل کیا گیا، اور مولوی حید رحسن خانصاحب کو مدرس اول اور والد صاحب مرحوم[ل] کو مدرس دوم مقرر کیا گیا، اس کے افتتاح کے موقع پر خود نواب صاحب نے شیخ محترم سے تلمذ حاصل کیا اور بخاری شریف کا درس لیا،

۱۳۶۴ھ میں مولانا حید رحسن خاں صاحب کے انتقال کے بعد مدرسہ پھر تالاب موتی باغ کی عمارت میں منتقل ہو گیا، اور تقسیم ہند کے بعد تک قائم رہا، لیکن آبادی سے باہر واقع ہونے کی وجہ سے نہ چل سکا، اور اب مدرسہ کی عمارت خالی پڑی ہوئی ہو،

دیگر مدارس ان مدارس کے علاوہ مدرسۂ تعلیم الاسلام واقع جامع مسجد امیر گنج، مدرسۂ گلزار باغ، مدرسہ قرآنیہ واقع مسجد مولوی امام الدین ٹونک کہنہ، مسلم اسکول قافلہ اور مدرسۂ عزیز یہ بنات المسلمین وغیرہ کئی مدرسے قائم ہیں، لیکن اکثر مکاتب کی شکل میں ہیں۔

(باقی)

[ل] مولوی قاضی حکیم محمد عرفان خانصاحب ناظم عدالت شرعیت ٹونک، المتوفی ۱۳۸۱ھ۔

مطبوعات جدیدہ

معاشری وعلمی تاریخ ۔ از ڈاکٹر سید معین الحق، صفحات ۴۷۴، کتابت وطباعت متوسط، ناشر سلمان اکیڈمی، حق نشان ۳۰ نیو کراچی، ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵، قیمت ۱۲ روپے

سلمان اکیڈمی کراچی سے جو مفید کتابیں شائع ہوئی ہیں، اُن میں یہ کتاب بھی ہے، اس سے پہلے اس ادارہ کی متعدد کتابوں پر معارف میں تبصرہ ہو چکا ہے،

ہندو پاکستان پر ایک ہزار برس تک مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ہی نہیں رہا بلکہ معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی قیادت بھی ان کے ہاتھ میں رہی، جس کے اثرات آج بھی ہندو پاک کی ہر چیز میں نمایاں ہیں، تاریخ مسلمانوں کا خاص فن ہے، انھوں نے تاریخ نویسی کا ایک معیار قائم کیا مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ہندوستان میں جو تاریخیں مرتب ہوئیں، اُن میں بادشاہوں کے ذاتی حالات، انکی کشمکش اور ان کے جنگی کارناموں پر زیادہ زور دیا گیا ہے، معاشرہ کے عام دینی، معاشرتی اور اقتصادی حالات بہت کم ملتے ہیں، مگر علماء کے تذکروں، صوفیہ کے ملفوظات اور خود ان تاریخوں میں ضمنی طور پر اتنا مواد موجود ہے کہ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو مسلمانوں کے معاشرتی، علمی اور ثقافتی کارناموں کا بہت اچھا مرقع تیار کیا جا سکتا ہے، فارسی تاریخوں کے تتبع میں اردو زبان میں بھی بیشمار تاریخیں لکھی گئی ہیں جن میں زیادہ تر سیاسی رنگ غالب رہا، اس لیے ضرورت تھی کہ مسلمانوں کی سیاسی و حربی تاریخ کے بجائے ان کی ثقافتی و علمی تاریخ لکھی جائے، اس کا احساس سب سے پہلے حضرت الاستاذ سید صاحب نے کیا اور انھوں نے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کے بجائے ان کی معاشرتی

علمی اور تمدنی تاریخ مرتب کرنے کا باقاعدہ پروگرام بنایا، چنانچہ اس سلسلہ میں دارالمصنفین سے ابتک تقریباً نصف درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، ڈاکٹر معین الحق صاحب بھی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب لکھکر اس پہلو کو مزید واضح کرنے کی کوشش کی ہے، ڈاکٹر صاحب کا قلم اور دماغ دونوں بہت متوازن ہیں، اس لیے واقعات کو وہ انتہا پسندانہ انداز کے بجائے اس کی صحیح صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں دور از کار تاویلات کے بجائے اہل علم کو اپیل کرنے والی توجیہ و تطبیق سے کام لیتے ہیں، مجدد صاحب کی اصلاحی کوششوں اور جہانگیر کی ان سے ناراضگی اور قید و بند اور رہائی پر ایک نئے انداز سے بحث کی ہے، انھوں نے اس کو انفرادی کوشش کے بجائے ایک تحریک قرار دیا ہے جس میں مجدد صاحب کے علاوہ بہت سے بزرگوں نے حصہ لیا، اسی طرح اور بہت سے مسائل میں انھوں نے بڑی اچھی بحثیں کی ہیں، امید ہے کہ یہ کتاب علمی حلقوں میں پسند کی جائے گی،

بہادر شاہ ظفر - از منجو قمر یداللہی، ۱۸۴، کتابت و طباعت معمولی، ناشر نگاہ پبلیکیشنز، بیگم بازار، حیدرآباد۔

اردو میں ڈرامہ یا ناٹک لکھنے اور اسٹیج کرنے کا رواج واجد علی شاہ کے دور سے ہوا، ان کے درباری شاعر امانت نے سب سے پہلے اپنا منظوم ناٹک اندر سبھا پیش کیا، اس کے بعد اور بہت سے لوگوں نے اس کو ترقی دی، خود ہندوستان کے مشہور ناٹک شکنتلا کا ترجمہ بھی اردو میں ہوا، "بہادر شاہ ظفر" بھی اس سلسلہ کی ایک اچھی اور پاکیزہ پیش کش ہے، کئی سال پہلے اندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی نے اردو ڈراموں کا مقابلہ کرایا تھا، یہ ڈرامہ اسی موقع پر پیش کیا گیا تھا اور تمام ڈراموں میں بہترین قرار پایا، اور اس پر مصنف کو اکیڈمی نے انعام بھی دیا، مصنف نے

کہیں بھی تاریخ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے، اور اس کے سب مکالمے لال قلعہ کی اردوے معلی میں ہیں، قلعہ کی معاشرتی زندگی کی بڑی خوبی سے مصوری کی ہے، امید ہے کہ ڈرامہ اردو زبان کے پاکیزہ ڈراموں میں ایک ممتاز مقام پائے گا۔

نوادرات علمیہ - از نذر صابری، صفحات ۴۱، کتابت و طباعت متوسط، ناشر مجلس نوادرات علمیہ اٹک۔ قیمت عہ

یورپ میں علمی نمائش کا کافی رواج ہے، مگر ہند و پاک میں یہ رواج کم ہے، خوشی کی بات ہے کہ مجلس نوادرات علمیہ نے آج سے کئی سال پہلے مخطوطات کی ایک نمائش کا اہتمام کیا تھا، اور اس میں بہت سے علمی و تاریخی قدیم مخطوطے پیش کیے تھے، اسی نمائش کی روداد اور مخطوطات کی خصوصیات وغیرہ کو نوادرات علمیہ کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، کتابوں کے طبع ہو جانے کے بعد بھی ان کے مخطوطات کی قدر و قیمت نہ صرف ایک قدیم یادگار کے طور پر باقی رہتی ہے، بلکہ وہ جن جن لوگوں کی ملکیت میں رہتی ہیں ان کی مہروں اور دوسرے قرائن سے بسا اوقات تاریخی واقعات کی ترتیب میں بھی مدد ملتی ہے، اس لیے یہ کوشش قابل تعریف ہے۔

حج و زیارت - از مولانا شاہ عون احمد صاحب، صفحات ۱۰۸، کتابت و طباعت بہتر، پتہ دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

حج بیت اللہ و زیارت مدینہ منورہ پر سینکڑوں کتابیں، رسالے اور سفرنامے لکھے جا چکے ہیں، اور ہر سال لکھے جاتے ہیں، یہ رسالہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، مگر یہ نہ تو سفرنامہ ہے اور نہ حج و زیارت پر کوئی مفصل کتاب، بلکہ مولانا عون احمد صاحب قادری نے عمومی ضرورت کے پیش نظر حج و زیارت مدینہ کے بارے میں کچھ ضروری باتیں نوٹ کر لی تھیں، چنانچہ ان کے متوسلین اور دوسرے مسلمان جب حج و زیارت کے بارے میں ان سے سوالات کرتے تھے

تو انھیں اپنے اسی نوشتہ کو نوٹ کر لینے کی ہدایت کر دیتے تھے، ان ہی مختصر نوٹس کو اب کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، آخر میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حج کی تفصیل اور بعض دوسری اہم ہدایات بھی اسی میں شامل کر دی گئی ہیں، جن سے حج کی تمام ضروری باتیں اس مختصر رسالہ کے ذریعہ معلوم ہو جاتی ہیں، امید ہے کہ یہ رسالہ عوام و خواص دونوں میں پسند کیا جائے گا،

شعلہ نوا - از تلوک چند محروم، صفحات ۲۷۸، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، قیمت ۳؎

تلوک چند محروم اس دور کے مسلّم اساتذہ میں ہیں، اس سے پہلے ان کے کلام کے چار پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں، یہ مجموعہ ان کی زندگی کے تیسرے دور یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کے کلام پر مشتمل ہے، وہ غزل کی جدید صالح قدروں کے قدر دان ہیں مگر وہ جدید شعراء کی قلمی انارکی اور بے راہ روی کو ناپسند کرتے تھے۔

آزاد قید و بند سے ہیں اہل فن — پابند یعنی کوئی کسی بات میں نہیں
جو جس کے جی میں آئے لکھے اور چھاپ دے — کچھ فرق شعر اور خرافات میں نہیں

ان کا کلام تعارف و تبصرہ سے مستغنی اور استادانہ پختگی کا نمونہ ہے، امید ہے کہ اصحاب ذوق میں ان کے دوسرے مجموعوں کی طرح یہ مجموعہ بھی مقبول ہوگا،

"م، ج"

جلد ۹۸ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۶ء عدد ۳

مضامین